905
LIBRARY
ESTD 1992

دوسری منزل

امرتا پریتم

905

گیان پیٹھ انعام یافتہ

امرتا پریتم

کی

انوکھی تخلیق

دُوسری منزل

(اردو روپ: مسعود منور)

MILLI ... COLLEGE
905

دوسری منزل

امرتا پریتم

ماڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولامارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

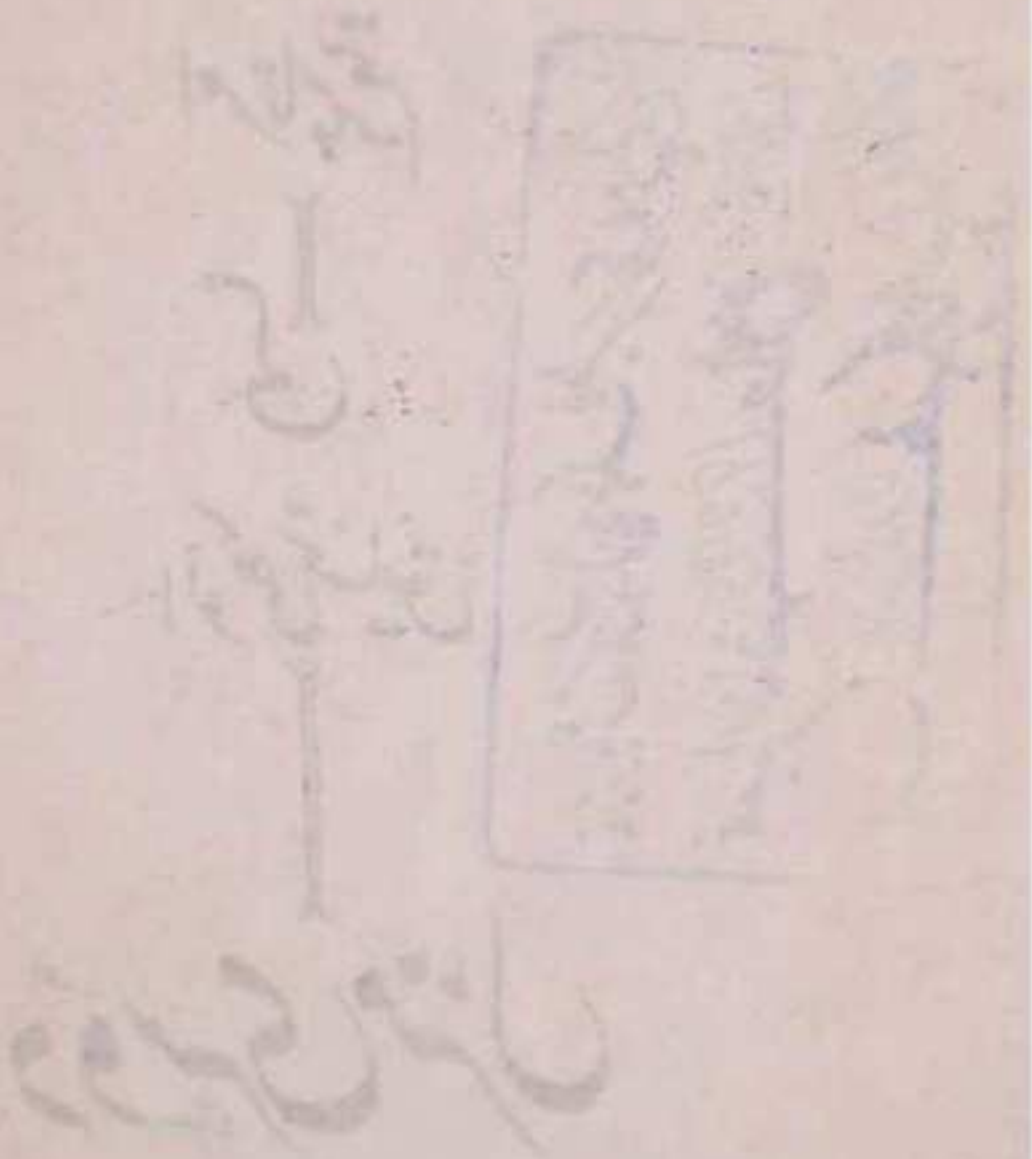

DOOSRI MANZIL (FICTION) by
AMRITA PRITAM
30.00

© امرتا پریتم

پہلی بار : فروری ۱۹۸۴ء

قیمت : تیس ۳۰/- روپے

کتابت : رحمت علی خاں رام پوری

طباعت : نعمانی پریس دہلی

زیر اہتمام

پریم گوپال متل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Benazir

COLLEGE

مترجم کا اعتراف

امرتا پریتم پنجاب کے لوک، روحانی، اساطیری اور شعری ادب کی روحِ جدید ہیں۔ اُن کے تخلیقی ادب کے بارے میں بات کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پنجند کنارے کھڑا بہتے پانیوں پر کوئی نام لکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ امرتا پریتم کی کتاب "دوسری منزل" کو اردو میں منتقل کرتے وقت بار ہا محسوس ہوا کہ میں غیر منقسم پنجاب کی ایک نادرِ روزگار تصویر کے قدیم رنگوں کو واضح کرنے کے لئے نئے رنگوں کا کوٹ" چڑھا رہا ہوں۔ امرتا کا پنجابی لب ولہجہ اور اسلوب پنجاب کی اردو سے بہت قریب ہے، وہ اردو کے الفاظ کو بالکل اہلِ لاہور کے سے انداز میں برتتی ہیں اور ان کا یہی وظیفہ انھیں ایک غیر منقسم آواز کے لمس میں تبدیل کر دیتا ہے۔ میں نے ان کہانیوں کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے اس بات کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ پاکستان کی تازہ ترین نثری اردو کا ذائقہ پوری طرح رچ جائے۔ پاکستان میں مقامی روزمرہ

اور محاورہ علاقائی زبانوں سے نکل کر اردو کے حلقہ میں بڑی تیزی سے داخل ہو رہے ہیں اور ایک ایسی نثری سطح کو جنم دے رہے ہیں جو تیس کی دہائی میں لکھی جانے والی ترقی پسندوں کی سطح سے قدرے مختلف ہے۔

امرتا کے یہاں زندگی کی سچائیوں کا بیان غایت درجہ موضوعی ہے۔ وہ آج کے انسان کی باطنی کشمکش کو اُس ساحری سے پینٹ کرتی ہیں کہ قاری مسحور ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ کتاب کو دوسرا لسانی روپ دیتے ہوئے میں کہانیوں کی گہرائی اور گیرائی میں کھو کر رہ گیا اور مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کا قاری، اس واردات قلبی سے بیگانہ نہیں رہ سکے گا جو ان کہانیوں کا مرکزی جوہر متعین کرتی ہے۔

مسعود منور

دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء

اُس کے لئے ابھی تک رات تھی۔

کنارِ آب کھڑی خودرو جھاڑی میں اس نے اپنی سمٹی سکڑی ٹانگوں کو سیدھا کیا تو پاؤں کے بَل کھڑا ہونے کی کوشش میں، جھاڑی کے بالائی سرے کی کونپلیں اُس کی گردن پر گدگدی کرنے لگیں۔

لیکن جب وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا، جھاڑی میں سے نکل کر کنارِ آب آن براجا، تب سطحِ آب پر پڑتی اپنی پرچھائیں اس کے دل کو ہلا گئی۔

شفّاف اور ٹھہرے ہوئے پانی میں اس کا پورا عکس مرتب ہو رہا تھا۔ لمبی اور پتلی ٹانگیں چھاتی کے پھیلاؤ کا ہلکا دودھیا نقش، دونوں پہلوؤں میں آگے اخروٹی رنگ کے پروں کا شوخ سایہ، پیشانی کے پاس، سر پر پہنے تاج جیسے، انتہائی چمک دار نیلے پروں کی جھلملاہٹ، بڑی لمبی اور پتلی چونچ کا غرور، اور آنکھوں کے اردگرد گہرے سرخ دائرے۔

تو یہ رات نہیں تھی، سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا... سو اسی باعث

اس کی پرچھائیں اتنی تیکھی دکھائی دے رہی تھی۔

طلوع ہوتے دن کے تصور سے، خوف کی ایک ایسی کپکپاہٹ اُس کے وجود کے آر پار سی ہوئی کہ ٹھہرے ہوئے پانیوں میں اس کا عکس لرز کر رہ گیا۔

اس نے جلدی سے اپنی چونچ کو پانی میں ڈبو کر ایک ہی سانس میں بہت سا سیال حلق میں اتار لیا، اس کے سوکھے ہوئے گلے کو خشک تراوٹ ملی تو اس نے پیاس کا خیال ترک کر کے حدِ نظر تک نگاہ ڈالی۔ تب نہایت سرعت سے وہ لمبی لمبی چھلانگیں مارتا، پانی کنارے کھڑی جھاڑی میں غائب ہو گیا۔

سرکنڈوں کی یہ جھاڑی بہت گھنی نہیں تھی۔ رات کی ظلمت جس کی بے سروسامانی کے چھیدوں کو مخفی رکھ سکتی تھی لیکن دن کی تیز روشنیوں میں اس کی کم مائگی اور بھی عیاں ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے وجود کو چھپا کر بھی مطمئن نہیں تھا۔

اور سرکنڈوں کی یہ جھاڑی بہت اونچی بھی نہیں تھی۔ نشست کی حالت میں تو وہ اس کو ڈھانپ لیتی پر ایستادہ حالت میں صرف اُس کی گردن تک کو حصار میں لے سکتی تھی۔ اس نے اپنے وجود کو جیسے اپنے وجود ہی میں سمیٹا اور بڑی سرعت سے سرکنڈوں کے تنکوں کو اپنی چونچ سے تھام کر اوپر کھینچنے لگا۔

جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے اس نے سرکنڈوں کو اوپر کھینچا اور

اپنے وجود کو ڈھانپنے کی کوشش کی ـــــ اور چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان اُس کی نیند اچٹ گئی۔

بستر کی اوپر والی چادر کو وہ نیند میں نہ جانے کتنی دیر تک کھینچتا رہا تھا کہ اسے پائنتی کی جانب سے وہ چادر پھٹی ہوئی نظر آئی۔

اس نے پلنگ پر آویزاں برقی قمقمے کا بٹن دبایا اور حیرت زدگی کے عالم میں اپنے کمرے میں نظر دوڑائی۔

عجیب خواب تھا ـــ کہ آج نیند میں وہ منطقہ حارہ میں پیدا ہونے والا وہ پرندہ بن گیا جو سارا دن روشنی سے خوف زدہ رہتا۔ کنارِ آب کی جھاڑیوں میں چھپ کر قیام کرتا ہے اور صرف رات کے گھور اندھیارے میں وہ اپنی جھاڑی سے باہر آتا ہے۔

اسے اپنے حلق میں اُسی طرح کانٹے چبھتے ہوئے سے محسوس ہوئے جیسے ابھی نیند میں ندی کنارے کھڑے ہو کر اپنی لمبی چونچ سے پانی کو ایک ہی سانس میں کھینچتے وقت محسوس ہوئے تھے۔

پلنگ کے پاس رکھے میز پر دھری کانچ کی صراحی میں سے پینے کے کتنے ہی گھونٹ لئے اور پھر ابھی دیکھے اپنے خواب کے متن پر غور کرنے لگا۔

غیر شعوری طور پر اُس کا ہاتھ اس کی چھاتی کی طرف بھی گیا اور اُس کی باہنوں پر بھی سرسرایا، جیسے ابھی اُس کے سارے پر جھڑ گئے ہوں اور وہ ایک پرندے سے ایک آدمی کی جون میں آگیا ہو۔

پر نہیں تھے لیکن پرندے کے سینے میں دھونکنی کی طرح چلتا

خوف اس لمحے بھی اُس کے اندر تھا۔ گو ابھی رات تھی، دن کا اجالا نہیں ہوا تھا مگر کمرے کے اندر کی مصنوعی روشنی سے خوف زدہ ہو کر وہ کمرے کی دیواروں کی طرف دیکھنے لگا۔

ایک دیوار سے لگی کتابوں کی ایک الماری تھی۔ اس کی بھٹکتی ہوئی نظر جب کتابوں پر پڑی تو اسے یاد آیا کہ گزشتہ روز اس نے ایک آسٹریلوی فن کار کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ دی ڈریم ٹائم بک (THE DREAM TIME BOOK) اُسی کتاب میں اُس نے منطقہ حارہ میں پیدا ہونے والے "طائرِ شب" کی تصویر دیکھی تھی جو دن بھر تو کنارِ آب سرکنڈوں کی جھاڑیوں میں چھپ کے رہتا ہے اور جب وہ سرکنڈے اُسے اپنے قد سے چھوٹے لگتے ہیں تو وہ اپنی چونچ سے سرکنڈوں کے تنکوں کو کھینچتا رہتا ہے تاکہ وہ جلدی سے اونچے ہو جائیں۔

اُسے اپنے خواب پر ہنسی آگئی، اور اُس نے پلنگ سے اٹھ کر کتاب کو پھر سے کھول کر دیکھا۔

پر اُس کی ہنسی اُس کے ہونٹوں کے پاس آکر، یکایک پسپا ہوتی اُس کے حلق میں پھنس گئی۔ پر میں نے خواب میں اُس پرندے کا روپ کیوں دھارا ہے؟

شاید پچھلے جنم میں میں خطِ استوا کا پرندہ تھا۔

شاید اگلے جنم میں، میں اس پرندے کی جون میں ہوں گا۔

شاید اسی جنم میں، بدن انسان کا اور روح اُس پرندے کی۔۔۔۔
اُس کی پیشانی کے اندر جیسے ایک ہوک سی اُٹھی اور وہ خانہ بدوشوں کی اُس کہانی کے بارے میں سوچنے لگا جو وہ رات کے پرندے کے بارے میں سنایا کرتے ہیں کہ پرندہ اصل میں ایک انسان ہوا کرتا تھا لیکن اُس کے ہمجولیوں نے اسے اتنا ستایا تھا کہ اُس نے حضورِ غیب میں التجا کی اور اپنے لئے پرندے کا روپ مانگ لیا۔ اس کی دعا بارگاہِ ایزدی میں قبول ہوئی اور وہ پرندہ بنا دیا گیا۔ مگر اس کے سینے کو سینچتا ہوا خوف پرندہ بن کے بھی اُس کے اندر پلتا اور بڑھتا رہا اور وہ ہمیشہ دن کے اجالے میں چھپ کے رہنے لگا۔

پر خانہ بدوشوں کی اس کہانی کا مجھ سے کیا ربط ؟
یہ کہانی میرے سینے میں کیوں اتر گئی ہے ؟
صرف یاد ہی میں نہیں، رات کے خوابوں میں بھی۔
زندگی کے چند برسوں نے، کتنی ہی آسائشیں اُس کے دائیں بائیں بچھائی تھیں اور حدِ نگاہ تک اُسے راستے مخملیں دکھائی دیتے تھے لیکن آج وہ استعجاب میں تھا کہ وہ کون سا اندیشہ تھا، جو رات بھر اُسے سرکنڈوں کی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔
اور رات ٹھہرے ہوئے پانی میں اُس کا عکس تک لرزاں تھا۔
اس نے کتاب کا وہ صفحہ پلٹا جس پر اُس طائرِ شب کی شبیہہ کھنچی تھی اور اگلے صفحات میں بکھری دوسری تصویروں کو دیکھنے لگا۔

یہ تصویریں اُس نے کل بھی پیاسی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ یہ اُس کی انڈے کی تصویر تھی، جس کے شکست ہونے پر اُس کے باطن سے پہلا سورج طلوع ہوا تھا۔

وہ پرندہ جو نسل انسانی کے لئے اپنے سر پر آگ رکھ کر نکلا تھا اور جس کے پر ہمیشہ کے لئے شفق گوں ہو گئے۔

وہ ریختہ چٹانیں، جن میں سے جیسے اب بھی ایک طوفان کی آواز سنائی دے رہی ہو۔

اُس نے ہاتھ میں تھامی کتاب کو ایک طرف رکھ دیا۔ رنگوں میں سے طوفان کی آواز سنائی دینے کا یہ احساس بہت ہی بھیانک تھا۔

کتاب جیسے ہی اس نے رکھی تھی ویسے ہی بند اور خاموش پڑی تھی پر جلی حروف میں لکھا اس کا نام جیسے اس کی آنکھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں قید کر چکا تھا ——— "ڈریم ٹائم بک"

کھانے کے اوقات، کام کے اوقات، سونے کے اوقات، فرصت کے اوقات .... سب اوقات لوگوں نے وضع کئے مگر یہ کس قسم کا آدمی ہے؟ وہ سوچنے لگا جس نے خواب دیکھنے کے اوقات وضع کر کے اس کتاب کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

رات والا خواب پھر اس کی یاد میں سرسرایا تو کتاب کی طرف سے منہ موڑتے اسے لگا جیسے وہ خود کتاب کا ایک صفحہ بن کے کتاب میں رہ گیا ہو اور جیسے اب کتاب سے نہیں خود اپنے آپ سے جدا ہو کر

اپنے سونے کے پلنگ کی سمت جا رہا ہو۔

پلنگ کے پاس کھڑے ہو کر، وہ کتنی دیر رات کے خواب کی کشمکش کے دوران پائنتی کی طرف سے پھٹی چادر کو دیکھتا رہا۔

وہ سوچتا رہا کہ میں اس چادر میں اپنے وجود کو کیوں چھپا لینا چاہتا تھا کیوں؟ کس سے؟

اور اچانک اس کی نگاہ اوپر اٹھ کر چھت کے کونے کی طرف گئی جہاں ایک مہین سا جالا تنا ہوا تھا اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کونے میں بیٹھ کے وہ نیچے پلنگ کو تک رہا ہو۔

خوف کا ایک تاریک سایہ جیسے اس کونے میں معلق ہو۔

اسے جالے سے نہیں خود سے نفرت سی ہونے لگی کہ جانے کیوں معمولی سے جالے کو اس کے ذہن نے خوف کے تاریک عکس سے کیوں کر تشبیہہ دی ہے۔

یہ فراغت کے وہ دن تھے جو بڑے سرکاری منصبوں پر تعینات لوگوں کی بیرونی ممالک میں تبدیلی کے موقع پر میسر آتے ہیں۔

ان دنوں وہ بالکل اکیلا تھا۔

اس کا سامان، جو اس کے ہمراہ بیرونِ ملک جانا تھا، اُس سے پہلے بحری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

اس کی بیوی، اپنی تین برسوں کی جدائی سے پہلے، کچھ دن اپنی ماں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی اس لئے وہ میکے میں تھی۔

اس کی وزارت کا شریک کار اور ماتحت عملہ اسے الوداعی دعوت دے کر اپنی طرف سے رسمی طور پر رخصت کر چکا تھا۔

اور اس وقت اُس کے ہمراہ اُس کی تنہائی تھی۔

اگر اس کی اپنی ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی اس کے پاس جا کر زندگی کی اُس کامیابی کی خوش خبری سناتا پر وہ زندہ نہیں تھی۔ اس لئے یہ خبر بھی اُسی کی طرح اس کے کمرے میں اکیلی تھی۔

سو یہ تنہائی کا ہنگام تھا۔

بیتی ہوئی راحتوں اور آنے والی آسائشوں کا درمیانی وقفہ۔

جیسے دو ملکوں کی سرحدوں کے درمیان غیر مملوکہ علاقہ۔

غیر مملوکہ ..... اسے خیال آیا کہ شاید اسی وقفے کو کتاب والے آسٹریلیائی نے خواب کا ہنگام قرار دیا ہے .... سپنوں کا سمے۔

پر پہلی ہی رات کا یہ پہلا سپنا کس طرح کا تھا۔

اک پیاس

اک خوف

ٹھہرے ہوئے پانیوں میں اس کے جسم کی کانپتی پرچھائیں ....

سوچ کی ایک پپڑی سی اُس کے ہونٹوں پر جم گئی ——— کہ سپنوں کا ہنگام اتنا بھیانک ہوتا ہے؟

(۲)

اس کی خواب گاہ اور باہر کے بڑے ملاقاتی کمرے کے درمیان ایک مختصر سا کمرا تھا جو کبھی کسی نے نہیں کھولا تھا۔

صرف وہی کبھی اُس کمرے کو کھولتا تھا، پر وہ بات بھی بہت پہلے کی تھی۔ اُس نے اُس "بہت پہلے" کا اندازہ سا لگانے کی کوشش کی، پر وقت کی پگڈنڈی پر اتنی گھاس پھوس اُگ آئی تھی کہ اُسے وقت کے نقشِ پا دکھائی نہ دیئے۔

صرف ایک خیال آیا۔ کہ یہ بند کمرا شاید اُس کی اور اُس کی بیوی کی خواب گاہ اور اُس کی زندگی کی کامیابی کے لمحے اس کے ملاقاتی کمرے کے درمیان بنا ہوا وہ کمرا ہے جو اپنے سارے اندھیرے کو سمیٹ کر بھی ہمیشہ خاموش رہتا ہے ـــ لیکن ہمیشہ جوں کا توں رہتا ہے۔

اور وہ کمرا اپنی دونوں سمتوں پر بنے دونوں کمروں کی روشنی کے وسط میں دل کے پورے اندھیارے کے ساتھ مسکراتا ہے۔

اُسے لگا ـــ شاید دونوں کمروں کی روشنیاں کبھی کبھی حیران ہو کر اس وسطی کمرے کو دیکھتی ہیں۔ ..... شاید اسے کچھ پوچھتی ہیں لیکن بے بس ہو کر اپنی جگہ پر ساکت رہتی ہیں ـــ وہ اس اندھیرے میں کہیں بھی شگاف نہیں ڈال سکتیں۔

اُس کا اپنا ہاتھ، آج جیسے اُس کے بدن سے باہر نکل کر اس اندھیرے

کی سمت بڑھا — اس کے بند دروازے کی طرف ..... اور پھر ایک گہرائی سی اُس کے اندر اتر کر اسے انگلیوں سے ٹٹولنے لگی۔

اُس کمرے کی ایک کھڑکی دن کی روشنیوں کی سمت کھلتی تھی لیکن کافی عرصے سے اُس کے کواڑ اندھیروں اور روشنیوں کے درمیان' الجھ کر رہ گئے تھے۔

اُس نے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر وہ کھڑکی تلاش کی، اور اس کے بھڑے ہوئے کواڑوں کو کھینچ کر کھولنے لگا۔

شاید جسم کی کھال کی طرح لکڑی کو بھی درد کا احساس ہوا، کواڑوں میں سے ایک چھیدتی ہوئی سی آواز نکلی .....

اُس کے ہاتھ سنسنا اٹھے، لگا، جیسے کھڑکی کی لکڑی میں رینگتا درد بھی' اُس کے اپنے وجود میں سے گزرا ہو۔

آخر کھڑکی کے کواڑوں نے اس کا کہا مان لیا اور اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ انھوں نے کبھی اُس جگہ پر کھڑا ہونے کے لئے بھی اسی کا کہا مانا تھا۔ آج بھی اسی کا کہا مان کے، دور ہٹ گئے' اور باہر سے آئے صبح کے اجالے میں اس کا منہ تکنے لگے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں — آج تم ادھر کیسے نکل آئے؟ تمھیں یہ فراغت کیسے نصیب ہوئی۔ فرصت کے اس بھیانک پن کا شاید آنے والے کو اُن کواڑوں سے بھی زیادہ احساس تھا۔ وہ آنے والے کے چہرے کی اداسی کو پگھلتی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اندھیرے کا دل بھی کچھ پگھل سا گیا — اور اندھیرے نے جو کچھ بھی چھپا کر

رکھا ہوا تھا، دیواروں کے سینے سے لگا کر، وہ سب کچھ آنے والے کی نذر کر دیا۔

آنے والے نے دیوار کے ساتھ لگے ایک کینوس کو دیکھا، جس پر دھول کی ایک تہہ جم گئی تھی۔

اُس نے اپنی انگلی کے ساتھ اس غبار کو چھوا۔ تو کینوس پر ایک لکیر سی کھنچ گئی، جیسے غبار اک رنگ ہو اور انگلی برش۔

کینوس خالی تھا، اس لئے غبار کی تہہ کے نیچے سے کوئی سبز یا زرد رنگ نہیں جھلکا تھا۔ صرف دھول میں کچھ نقش بنتے اور بگڑتے تھے۔

" خالی کینوس لے کر رکھنے کا کیا فائدہ؟ ایک نہیں، دو نہیں، کتنے ہی.... ..... لیکن کیوں؟ بہت دیر پہلے ایک بار اس کی بیوی نے اس پر تاؤ کھا کر پوچھا تھا لیکن اُس نے اسے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔

آج بھی وہ سوال جیسے کمرے کے اندھیرے میں معلق تھا۔

شاید یہ سوال ہمیشہ اس کے گھر کے ایک کونے میں لٹکتا رہے گا؟

اسے خیال آیا —— گھر بدل سکتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، جہاں بھی جاؤ وہاں گھروں میں گوشے ہوتے ہیں اور گوشوں کے اندھیرے.... —— اور اندھیروں میں آویزاں رہنے والے سوال۔

جواب، نہ وہ اپنی بیوی کو دے سکتا تھا، نہ اپنے باپ کو، اس لئے اسی طرح سر نیہوڑائے، اپنی انگلی کے ساتھ، کینوس پر جمی غبار کی تہہ میں لکیروں سے نقش آرائی کرتا رہا۔

دھول کی لکیریں، خم کھائی ہوئی، ٹوٹتی، کہیں پر گولائیوں کو جنم دیتی

ہوئی ـــــ جب ایک عجیب سا دائرہ بن گئیں ـــــ تو اُسے ہوش آیا کہ اس نے اپنی انگلیوں سے اس دھول میں کسی کا نام لکھا ہے۔

اُ ـــ ر ـــ مِلا ـــ

• یہ نام اُن لکیروں میں ٹوٹ بھی رہا تھا، جڑ بھی رہا تھا۔
جیسے وہ ہوا میں معلق سوال کا جواب دے رہا ہو۔

دھول کی تہہ میں سے نکلی آواز جب اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اسے لگا جیسے وہ چپ کی آواز اس کے کانوں کو چھیدتی، اس کے پورے وجود کے انگ انگ میں سے گزرتی اس کے پاؤں کی ایڑیوں تک اتر گئی ہو، اور اس کے پاؤں، اُس جگہ اُس فرش پر منجمد ہو گئے ہوں۔

اسے ایک عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ یہ پاؤں آج سے نہیں جانے کتنے برسوں سے اسی جگہ گڑے ہوئے ہیں اور جب وہ اپنے سرکاری منصب کے تقاضے پورے کرنے کے لئے جاتا ہے تو اس کے پاؤں اس کے ساتھ دفتر نہیں جاتے...... اور جب وہ اپنی بیوی کے بستر میں سونے کے لئے جاتا ہے تو اس کے سارے اعضا اس کے ساتھ بستر میں جاتے ہیں، لیکن اس کے پاؤں ـــ ساتھ نہیں ہوتے۔

تو اسے لگا ـــ اب جبکہ وہ تین برسوں کے لئے پہلے سے بھی بڑے منصب پر فائز ہونے کے لئے، اس ملک سے باہر جائے گا تو اُس کے پاؤں اس کے ساتھ نہیں ہوں گے۔

۔ ایک گُل شدہ چراغ کی لَو، نہ جانے کس طرح سکّے کی طرح بھاری

ہوگئی تھی اور اس کے پاؤں کی ایڑیوں میں جا کر اس طرح سرایت کر گئی تھی کہ اس کے پاؤں جہاں کبھی ایستادہ تھے، وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔

اور اُسے احساس ہوا کہ وہ ہمیشہ اپنے پاؤں کے بغیر ہی چلتا رہے گا۔

(۳)

اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور خانہ بدوشوں کی ایک قدیم داستان کی طرح، اُن دنوں کی بابت سوچنے لگا — جب وہ پاؤں ہوا کرتے تھے ...

جوانی نام کی ایک مملکتِ خداداد تھی، جس میں گنگا جیسے کتنے ہی دریا بہتے تھے۔

جہاں جہاں خوابوں کے بیج گرتے تھے، وہیں بہت شاداب اور بے حد معجزاتی درخت اُگ آتے تھے۔

درختوں میں پھول بھی آتے تھے اور پھل بھی، خواہ آس پاس کے کئی لوگ اُسے دھیمے لہجے میں بتاتے تھے کہ یہ سب ممنوعہ پھلوں اور ممنوعہ پھولوں کے پیڑ ہیں۔

پر لوگوں کا کیا تھا، اس کے اپنے من نے اسے کہا تھا کہ وہ ممنوعہ پھول بھی چنے گا اور ممنوعہ پھل بھی پائے گا۔

یہ جب کی بات ہے ——— جب اس کے پاؤں ہوا کرتے تھے اور ایک دن اس نے دور سے دیکھا کہ دل کی ایک اونچی شہ نشیں

پر بیٹھ کر اُرملا کچھ کاغذوں پر پنسل سے کچھ تصویریں بنا رہی ہے اور وہ پاؤں پاؤں چلتے ہوئے نہیں بلکہ پر لگا کر اڑتا ہوا، پیچھے سے جا کر اس کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔

اُرملا کا پورا جسم اُس کے سائے میں ملفوف ہو گیا تھا۔ سائے میں نہیں، اس کے وجود میں۔۔۔۔

اور اُس نے ارملا کی پشت پر سیاہ آبشار کی طرح گرتے بالوں میں ہاتھوں کی انگلیوں سے سرحدیں بناتے ہوئے پوچھا تھا، "ارملا، تم رنگوں سے تصویر کیوں نہیں بناتی؟"

"کسی دن بناؤں گی" کہتے ہوئے وہ ہنس پڑی تھی۔

"مگر کب؟" اُس نے پوچھا تھا تو ارملا نے کہا تھا کہ "جب رنگ خریدنے کے لئے پیسے ہوں گے"۔ اقبال! جب۔۔۔۔

اُس نے یہ بات سنی تھی، پر سمجھی نہیں تھی، سمجھتے ہوئے اُسے یہ بات بہت چھوٹی لگی تھی کہ رنگوں کے لئے پیسے اگر آج نہیں تو کل ہوں گے ہی۔۔۔۔

پر آج اور کل میں اس نے یہ نہیں جانا تھا کہ مفلسی اور ناداری کے فاصلے بہت لمبے ہوتے ہیں جو کبھی کبھی صرف ایک جنم میں طے نہیں ہو سکتے۔

ان دنوں ابھی اس نے ممنوعہ پھولوں اور ممنوعہ پھلوں کا مطلب بھی نہیں جانا تھا۔ یہ اسے بہت عرصے میں پتہ چلا کہ ناداری کے پھول گھروں میں سجانے کے لئے نہیں ہوتے اور غریبی کے پھل بھی پانے کے لئے نہیں ہوتے۔

پر سمجھ کی حدود میں آکر بھی، کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھ سے دور کھڑی رہتی ہیں۔

اسے محسوس ہوا..... کہ وہ ارملا کے لمبے اور کھلے بالوں میں ہاتھوں سے رکاوٹیں ڈالتا، ایک دن خود ہی اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا تھا.... اور شاید ہمیشہ کے لئے اس کے وجود کا ایک ٹکڑا، وہیں اُس کے بالوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

اور اس کے وجود کا وہ حصہ جو اس سے بہت دور چلا گیا تھا کبھی کبھی وہ رنگ اور کینوس خرید لیا کرتا تھا، جو ارملا نے خریدنے تھے۔

اُسے معلوم تھا..... کہ نہ تو اب یہ رنگ ارملا تک پہنچ سکے گا، نہ یہ کینوس، یہ سب کچھ تو ہمیشہ اک بند کمرے میں پڑا رہے گا۔ جہاں رنگ خشک ہو جائیں گے..... لیکن پھر بھی وہ خریدتا رہا، رکھتا رہا اور سمجھ کی حدود میں آکر بھی، یہ ساری باتیں اس کی سمجھ سے ہٹ کر کھڑی رہیں اور شاید اس پر ہنستی بھی رہیں..... اقبال کے ماتھے پر کھنچی سوچ کی لکیر کو دیکھ کر وقت نے بے ہنگم سا قہقہہ مارا اور جب اقبال نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنے لئے ایک سگریٹ سلگا لی، تو وقت بھی ایک بوڑھے خانہ بدوش کی طرح ہتھیلی پر تمباکو رگڑ کر چلم میں ڈالتا ہوا، اقبال کو ایک قدیم داستان سنانے لگا۔

"ایک تھا عرب نوجوان، اور ایک تھی عرب حسینہ"

کہانی اقبال کی عین آنکھوں کے آگے مناظر میں تبدیل ہونے لگی۔

یوں جیسے کسی کو اپنا پچھلا جنم حقیقت میں نظر آجائے ــــ وہ جنم جب اقبال ایک عرب نوجوان تھا اور ارملا ایک عرب حسینہ ....

کالج کے تھیٹر گروپ نے دنیا بھر میں ہونے والی شادی کی رسموں کو اکٹھا کیا تھا اور ہفتہ وار تھیٹر میں اُن پر مبنی خاکے پیش کئے تھے اور جب ایک قدیم عرب شادی کی رسم کھیلی تھی تو اس کے لئے اقبال اور ارملا کو چنا گیا تھا۔

اقبال عرب پوشاک پہنے ہوئے تھے۔ موٹے سفید کپڑے کا سلوٹوں والا اُبّہ، جس کی گرہ سامنے کی طرف بندھی تھی اور وہ اسٹیج پر آراستہ ریت کی ویرانی میں بانسری بجاتا، دل کی لگی، ریگستانوں سے کہتا رہا۔

ارملا نے سینا کے ریگستان کا لمبا کرتا زیب تن کیا ہوا تھا جو اس کے ایک شانے پر سے گزرتا، دونوں گوشوں سے سامنے کی سمت بندھا ہوا تھا جس کے اندر سے اُس کا بایاں عریاں بازو ہوا میں یوں پھیلا ہوا تھا جیسے بانسری کے سروں میں سے نکلتی آواز کو وہ ریت میں گرنے سے بچا لینا چاہتی ہو۔

اور پھر ارملا نے اس کی بانسری کی عربی دھن میں اپنی آواز شامل کر دی اور پھر جیسے وہ دونوں ریت کے ٹیلوں کو چیر کر باہم ہوئے ہوں ارملا اس کی بانہوں میں سمٹ گئی تھی۔

اُس نے صحرائے سینا کی رسم کے مطابق ارملا کے ہونٹ چومے تھے اور پھر مسرت سے جھومتا، ریت کے ان ٹیلوں کو روندتا، اُدھر چلا گیا تھا

جہاں بستی کے لوگ رہتے تھے۔

بستی کے ایک گھر کے آگے بیٹھ کر اس نے پھر بنسری پر سُر چھیڑے تھے — اور بانسری کی آواز گھر کے بند دروازے پر دیر تک سر پٹکتی رہی تھی۔ اتنے میں اس کے عقب میں آہستہ آہستہ چلتی ارملا بھی آپہنچی تھی اور اس کے پہلو میں بیٹھ گئی تھی اور اس نے جسم کے اوپر رکھی اپنی چادر اتار کر ارملا کو سر سے پاؤں تک ڈھک دیا تھا۔۔۔۔۔

گھر کا دروازہ بالآخر کھل گیا تھا اور گھر کا بزرگ سامنے دہلیز پر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

اقبال نے اٹھ کر بزرگ کے پاؤں چھوئے تھے — اور حلیمی سے کہا تھا "میرے بزرگ! میں آپ سے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔"

"جواباً بزرگ مسکرایا تھا" نوجوان! میری بیٹی ایک ہیرا ہے، بہت قیمتی، تم اُس کی قیمت ادا کر سکتے ہو"

اور اتنے میں اس عرب عاشق کا باپ آن پہنچا تھا، جس نے احترام سے کہا تھا، "میں اپنے بیٹے کے لئے آپ کی ہیرے جیسی بیٹی کا ہاتھ مانگتا ہوں"

حسینہ کے باپ نے کہا تھا "دو ہزار پونڈ ادا کرنے ہوں گے۔"

اور عرب عاشق کے باپ نے کہا تھا "سب دے سکتا ہوں جو مانگو گے وہی دوں گا، پر دیکھنا میرا بیٹا صحراؤں کا پھول ہے، وہ ریگستانوں کا چشمہ ہے، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ، اور دیکھنا میرا بیٹا اس ویرانی میں کھجور کا نخل ہے۔"

حسینہ کا باپ مسکرایا تھا۔ "یہ میں مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں اور اس کے لئے پانچسو پاؤنڈ چھوڑتا ہوں۔"

اتنے میں صحرائے سینا کا قاضی آ پہنچا جس نے آتے ہی کہا "پانچ سو پونڈ میرے نام پر چھوڑنے ہوں گے، خدا کے نام پر اے خدا کے بندے"

حسینہ کا باپ پھر مسکرایا اور کہنے لگا، "اچھی بات ہے، پانچ سو پونڈ انسان کے نام پر چھوڑے تھے۔ اب پانچ سو خدا کے نام پر چھوڑتا ہوں۔"

اتنے میں حسینہ کی ماں بھی گھر سے باہر آتی ہے اور سامنے کی سمت سے اس کے عاشق کی ماں بھی۔

ایک ماں جب کہتی ہے "ایک سو پاؤنڈ میرے دودھ کے نام پر بھی چھوڑے جائیں۔"

تو دوسری ماں بھی کہتی ہے "ہاں ایک سو پاؤنڈ میرے دودھ کے نام بھی ——— "

تو حسینہ کا باپ ہنس کر دونوں عورتوں کی طرف دیکھتا ہے اور دونوں کے نام پر دو سو پونڈ اور چھوڑ دیتا ہے۔

تب دونوں کے بھائی آتے ہیں۔ ایک بھائی اپنے چھوٹے بھائی کی دائیں بانہہ بن کر آتا ہے اور دوسرا اپنی بہن کا پدر نما رکھوالا بن کر، اور دونوں کے نام پر دو سو پونڈ اور کم ہو جاتے ہیں۔

پھر دو بوڑھے دادے آتے ہیں۔ ایک حسینہ کا دادا اور ایک اس کے عاشق کا، جن میں سے پہلا کہتا ہے۔ "میری پوتی میرے گھر کے چراغ کی

روشنی ہے"، تو دوسرا کہتا ہے "میرا پوتا میرے گھر کا دیا ہے اور دونوں دادا ؤں کے نام پر ایک ایک سو پونڈ اور تفریق کر دیئے جاتے ہیں۔

پھر کئی آوازیں ابھرتی ہیں۔

"میں آج کے اس عاشق کا دوست ہوں، اُس کے بھائیوں جیسا..."

"میں آج کی ہونے والی دلہن کی سہیلی ہوں، بہنوں جیسی..."

"میں نے لڑکے کو علم دیا ہے"

"میں نے لڑکی کو ہنر سکھایا ہے"

اور گھر کے دروازے کی دہلیز میں کھڑا حسینہ کا باپ آج کے مطالبات سے سرشار جھومتا جھامتا کہتا ہے۔ "آپ سب کے نام پر میں سب کچھ چھوڑتا ہوں، صرف ایک سو پونڈ لوں گا۔

اتنے میں چاول چھڑکنے کی آوازیں آتی ہیں اور کارکنوں اور مزدوروں کے گانے کی آوازیں ....

لڑکی کا باپ پوچھتا ہے "یہ کیسی آوازیں ہیں، کتنی میٹھی لگ رہی ہیں"۔

لڑکے کا باپ جواب دیتا ہے، "گھروں کے آنگنوں میں ہانڈیاں چڑھ سکیں۔ اس لئے اس بستی کے کارکن چاول چھڑک رہے ہیں۔ دیکھنا ہوا میں کیسی دل فریب مہک ہے۔"

تو لڑکی کا باپ جواب دیتا ہے۔ "پھر ایک سو پونڈ میں دنیا کے سب محنت کشوں کے نام پر چھوڑتا ہوں ..... گھروں اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے نام پر۔"

اور پھر ـــــ بیاہ کا دسترخوان آراستہ ہونے لگتا ہے

کالج کے دنوں میں کھیلا ہوا یہ ناٹک اقبال کو یوں یاد آیا جیسے پچھلا جنم یاد آگیا ہو۔

ناٹک کھیلتے ہوئے بھی اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ صرف ناٹک ہے اور آج جب اُس کا ایک ایک منظر ذہن میں دوہرایا گیا تو ہو بہو اپنی آپ بیتی کی طرح کا احساس چھا گیا۔

جگ بیتی کس مقام پر آکے آپ بیتی بن گئی اقبال اس مقام کو اپنے سینے میں ٹٹولنے لگا۔

شاید ساری قدیم داستان میں جس اخلاق کا اظہار ہوا تھا . . قرابت داروں اور دوستوں کو پانے کے لئے مال و زر کی قربانی ـــــ اقبال سوچنے لگا۔ "شاید یہی وہ مقام تھا جہاں اس کے اور ارملا کے جہانِ فکر کی کھینچی ہوئی سرحدیں مٹ گئی تھیں۔

صحرائے سینا کی اس قدیم رسم، جس نے کئی برس پہلے اقبال کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ آج بھی اس کی آنکھوں کے آگے یوں چمک گئی تھی کہ اُس کا من چندھیا کر رہ گیا۔ اس رسم کا پھیلاؤ کس طرح دنیا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا ہے۔ صرف قرابت داروں اور دوستوں کو نہیں۔ سات پرائیوں کو بھی، صرف احترام اور محبت والی جگہ کو ہی نہیں، سات پرائے لوگوں کے محنت کرنے کے مقام کو بھی ـ اور رسم کا آخری حصہ ـــــ

آخری سو پونڈ کو دنیا کے محنت کشوں کے نام پر چھوڑ دینے والا حصہ —
اقبال کی آنکھوں میں اس رسم کو بہت اونچی رسم بنا گیا۔
لیکن رسم اس کی آنکھوں میں جتنی بلندی تک گئی اتنا ہی وہ خود چھوٹا ہوتا گیا۔
یوں لگا — وہ بانسری اس کی نہیں تھی — جو ریت کے ٹیلوں پر لے بن کر گونجی تھی، اس کے بول تو سب کے سب اڑتی ہوئی دھول میں گم ہو گئے۔
بانسری تو اس نے ادھار مانگی تھی۔ وہ سوچنے لگا — کیا میرے سینے میں ارملا کو چاہنے والا دل بھی اس نے ادھار لیا تھا۔

(۴)

بیرونی راہداری میں اچانک ایک کھٹکا ہوا تو اقبال یوں کانپ گیا جیسے کوئی قانون اپنی حدود سے باہر کسی دوسری حد میں داخل ہو گیا ہو۔ کسی جگہ پولیس کے چھاپے کی طرح۔
اقبال کے ہاتھ خالی تھے لیکن اسے لگا جیسے اچانک ہاتھوں سے کچھ چھوٹ گیا ہو۔ چوری چوری کشید کی جانے والی شراب کی طرح یا جعلی نوٹوں کی گڈی کی طرح۔

پہلے اُس کے حواس نے خود سنبھلنا چاہا اور پھر اس کو بھی سنبھالنا چاہا۔ کہا —— اخبار والے نے راہداری میں روز کی طرح صرف اخبار پھینکا ہے۔

پردہ کھٹکا جو باہر کی راہداری میں ہوا تھا، بیرونی نشست گاہ کی زنجیر کھول کر چلتا ہوا اندر آ گیا۔ اس مدت سے پڑے بند کمرے کے اندر۔

اب اس کمرے میں تنہا اقبال ہی نہیں تھا۔ وہ آواز بھی کمرے ہی میں موجود تھی۔

اقبال بھی چپ تھا اور اس کی طرح وہ آواز بھی۔ پر چپ ہو جانے سے وجود مٹ نہیں جاتے.... دونوں اپنی اپنی جگہ حقیقت تھے۔

اقبال کی ایک خفیہ کارگزاری کی طرح اور آواز کی پوشیدہ حرکت کو جھکا کر دیکھنے والے کی طرح۔

آج گھر میں اقبال کی بیوی نہیں تھی، نہ کوئی نوکر، لیکن ان لوگوں نے گھر سے باہر جا کر بھی اقبال کو اپنے وجود کا احساس دلانا ضروری سمجھا تھا۔ خواہ ایک چھوٹے موٹے دھماکے کی صورت میں ہی سہی۔

اقبال نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آپ کو اپنی تنہائی کا یقین دلاتا، بند کمرے کے مسخر طلسم کو پھر سے جوں کا توں بنانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن اس کے من کی ساری تنہائی زمین پر یوں بہہ گئی تھی جیسے

غیر قانونی طور پر کشید کی جا رہی شراب چھلک کر مٹی میں مل رہی ہو اور اب صرف ہوا میں اس کی مہک رچی ہو، جس کو نہ گلاس میں انڈیلا جا سکتا تھا اور نہ جس کا گھونٹ ہی حلق میں اتارا جا سکتا تھا۔

ایک پل تیکھی سی نفرت کی گرم باس اقبال کے سر کو چڑھ گئی ـــــ اور سر یوں گھومنے لگا کہ اس کا ہاتھ ایک سمت کی دیوار کا سہارا لیتا ضبط میں نہ رہ سکا۔

کیا نفرت سے بھی گرم باس اٹھ سکتی ہے؟ اسے خیال آیا اور ساتھ ہی وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا ـــ یہ نفرت گھر کی دیواروں میں سے اٹھ رہی ہے یا اُس کے اپنے جسم سے؟

ہر جگہ کی ایک اپنی مخصوص باس ہوتی ہے۔ خواب گاہ کی ایک عجیب چھپا لینے والی خوشبو، اور نشست گاہ کی کچھ ٹھنڈی اور اجنبی سی، اور ہر جسم کی اپنی اپنی ـــــ ایسی کہ کسی جسم کی جلد اپنے جسم کے ذریعے سونگھنے کو جی چاہتا ہے اور کسی کو....

لیکن آج جیسے ساری دنیا کی باس ایک جیسی ہو گئی تھی۔ اقبال کو محسوس ہوا تھا ـــــ اس گھر کی، گھر کی ہر چیز کی، اور گھر میں موجود اُس کے اپنے بدن کی....

اقبال نے پوری قوت صرف کر کے ایک سانس کھینچا اور ہوا کو سونگھا اور پھر ایک اونچا قہقہہ لگا کر سوچنے لگا ـــ نہیں یہ دنیا کی باس نہیں اور نہ اس گھر کی، یہ اس گھر میں مرے ہوئے ایک کمرے

کی باس ہے.....

اور ساتھ ہی اقبال کو ایک بھیانک خیال آیا.... اور تین دنوں میں، جب وطن سے باہر جاتے ہوتے، وہ اس گھر کو خیر باد کر دے گا کیا یہ مرا ہوا کمرہ سمندر پار، وہاں کے نئے گھر میں رہنے کے لئے بھی اس کے ساتھ چلا جائے گا؟

اس وقت اقبال جہاں کھڑا تھا، وہیں دائیں جانب کی نشست گاہ کے شیشوں والے دروازے میں سے بیرونی راہداری کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہیں جہاں آج صبح کا اخبار پڑا تھا..... اور دور سے اُس نے الٹے پڑے ٹیڑھے، اخبار پر نظر ڈالی، اقبال کو لگا جیسے آج کے اخبار کی پہلی سرخی یہ ہو کہ "آج ایک زندہ آدمی ایک مردہ کمرے میں پایا گیا ہے۔"

پھر نہ جانے کس وقت اقبال کے سامنے کسی نے اخبار لا رکھا اور اقبال نے دیکھا — کہ ایک خبر کے چاروں طرف پنسل سے گہری لکیریں کھینچی گئی تھیں۔

اور اقبال نے چونک کر کئی برس کی دوری پر بیٹھی ارملا کی طرف دیکھا اور پوچھا، "اس خبر کے چاروں طرف تم نے پنسل سے لکیریں کیوں کھینچ دی ہیں؟"

ارملا کا چہرا بہت اداس تھا وہ کہنے لگی، "خبر کے چاروں طرف نہیں، بے روزگاری کے چاروں طرف، مجبوری کے چاروں طرف..."

"کس کی مجبوری؟" اُس نے پوچھا تو ارملا نے کہا
"جس کو ایک روٹی چرانے کے جرم میں آج ایک ماہ قید کی سزا سنائی گئی ہے۔"
"تم اسے جانتی ہو؟"
تو جواب میں ارملا مسکرادی۔ "پہلے نہیں جانتی تھی لیکن اب جانتی ہوں، کل رات میں نے اس کے بھوکے بچوں کو دیکھا اور بچوں کی ماں کو.... اُس وقت، جب اسے جیل لے جایا جاچکا تھا" اور ارملا نے کہا ..... اخباروں میں ہمیشہ ادھورا سچ ہوتا ہے۔ دیکھ لو چوری کی بات وہ سب کو بتا رہے ہیں مجبوری کی بات کسی سے نہیں کہیں گے۔"
ارملا بدستور برسوں کے فاصلے پر کھڑی رہی، صرف یہ بات قریب آکر اقبال کے پاس کھڑی ہوگئی۔
اقبال نے گھبرا کر غسل خانے کے پانی کا نل کھولا اور کتنی بار اپنی آنکھوں پر چھینٹے دیئے۔
پتہ نہیں آنکھوں میں جمے بیتے دنوں کو دھونے کے لئے یا زمانہ حال کی گرد صاف کر کے بیتے دنوں کو اور واضح طور پر دیکھنے کے لئے اچانک اس کی آنکھوں میں ایک شفاف سی روشنی جھلکی ـــــ ریگستان کے ریتیلے ٹیلوں کو چیرتی اور اس کے بچپن اور جوانی والے اس کے کوہستانی گاؤں کے پتھروں تک پہنچتی ہوئی۔
سینا کی ریت، ریگستانوں کی وہ رسم، جس میں کسی کی ذاتی خوشی سات اجنبیوں کی محنت کو بھی اپنے سینے میں سمیٹ لیتی ہے اور اُس کے کوہستانی

گاؤں کی ارملا، جو سات اجنبیوں کو ایک مہینہ سنائی گئی سزائے قید اور اُس خبر کے اردگرد لکیریں کھینچ دیتی ہے۔

لاکھوں میلوں کی مسافت طے کر کے کس طرح انسان کے من کے دونوں کنارے ایک مشترکہ جگہ پر جڑ جاتے ہیں۔ اقبال حیران سا آنکھوں میں چمکتی اس روشنی کو محسوس کرنے لگا۔

روشنی کی لکیر ایک تھی ——— صرف اُرملا کے چہرے تھے، ایک ہوتے ہوئے بھی دو چہرے۔ ایک گلے میں پہنے عربی جامے کی سمت جھکا ہوا اور اپنے ہونے والے شوہر کی چادر میں لپٹا ہوا سرخ اور حیا میں ڈوبا چہرا اور دوسرا آنکھوں کے آگے اخبار رکھ کر پرائی بھوک پر تڑپ کر اداس ہوتا چہرا۔

اور ارملا اقبال کے جنم لینے اور پلنے اور بڑھنے کی وادیوں سے لے کر لاکھوں میل دور ——— عرب کے ریتیلے ٹیلوں تک پھیلتی چلی گئی....

دونوں سرے بہت دور تھے، ہاتھ کی رسائی کہیں بھی ممکن نہیں تھی اور وسط میں ——— وہ سارا تماشہ تھا جسے لوگ گھر کی دنیا کہتے ہیں۔

لیکن تولئے سے آنکھوں اور پیشانی کو پونچھ کر اقبال کو محسوس ہوا۔ جیسے درمیان میں جو کچھ تھا، وہ صرف کچھ دھبوں کی مانند رہ گیا ہے، اور شاید اسے بھی پونچھا جا سکتا ہے۔

اور اقبال کے بدن میں تھوڑی سی دھوپ چڑھ آئی۔

اس نے رسوئی میں جا کر گیس کا چولہا جلایا اور پانی کی کیتلی چڑھا دی۔

شیلف پر رات کی کافی والا پیالہ یونہی رکھا تھا۔ پاس ہی اگرچہ کانچ کی پٹی پر اور بھی پیالے تھے لیکن وہ شینک کی ٹونٹی کھول کر رات والے کو دھونے لگا۔

کیتلی کا پانی ابھی کھولا نہیں تھا۔ اس نے ہلکی آنچ کو تیز کرنے کے لئے زور سے پھونک ماری تو گیس کا شعلہ گل ہو گیا، اور گیس کی عجیب سی بُو اس کے سر کو چڑھنے لگی۔

لرزتے ہاتھوں سے دیا سلائی کے ساتھ گیس کا شعلہ روشن کرتے ہوئے اقبال کو اپنے ماتھے کے بیچ اس بہت پرانے دن کی یاد طلوع ہوتی محسوس ہوئی ۔ جب کالج کی پکنک کے موقع پر چشمے کے پتھروں پر بیٹھ کر جنگل کی سوکھی لکڑیوں کو اکٹھا کر کے ارملا نے چائے بنانے کی غرض سے آگ جلائی تھی اور وہ آگ کو جلتا رکھنے کے لئے نئی ٹہنیوں کو جلتی لکڑیوں کے ساتھ جوڑتا کئی بار آگ کو پھونک مار رہا تھا۔

ایک بجھی ہوئی لکڑی کا دھواں اس کی آنکھوں میں اتر گیا تھا۔ نہ جانے کیسا دھواں تھا کہ آج برسوں کے بعد اقبال کو یاد آ گیا، اور اس دھوئیں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں نمی سی نمودار ہونے لگی۔

کافی کا پیالہ تیار کر کے جب اقبال اپنے کمرے میں آیا ——

اچانک کل کو دیکھی تصویر یاد آ گئی ـــ جس میں سر کے گہرے سرخ پروں والا وہ پرندہ تھا جو نسل انسانی کے لئے دیوتاؤں کے گھروں سے آگ

چرا کر لایا تھا، اپنے سر پر رکھ کر اور جس کے سبب اس کے سر کے پر ہمیشہ کے لئے سرخ ہو گئے تھے۔

اقبال کو محسوس ہوا — وہ کل کی سچائی تھا اور آج کی سچائی اس کے بالکل برعکس ہے۔

اور ایک تصویر کی طرح، اس نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی، اور آئینے کی طرف انگلی کا اشارہ کرتا، وہ اپنے کانوں سے کہنے لگا۔

"لیکن یہ وہ انسان ہے۔ جو دیوتاؤں کے ہاں سے دھواں چرا کر بھاگا ہے۔"

کانوں میں ایک آواز سی گونجی ..... عقب کی جانب .... اس نے منہ موڑ کر ٹاٹیلوں والی چھت کے نیچے، کچے آموں کی چٹنی رگڑتی اپنی ماں کو دیکھا۔

ماں کے چہرے کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنا چاہا، لیکن آنکھوں کے آگے بیس برسوں کے عرصے کا دھواں پھیل گیا۔

دھواں ادھر تھا، ماں کے چہرے سے اس طرف .... اور چہرا دھوئیں کے مرغولوں کے اُس پار تھا ....

اس نے دھوئیں میں ہاتھ چلایا، ہاتھ سے دھوئیں کو ایک طرف ہٹایا اور مصالحہ پیسنے والے پتھر کی رگڑوں کی آواز سے سمت کا اندازہ لگانے لگا۔ .... جہاں ماں لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھی سبز مرچوں اور کچے آموں کی چٹنی تیار کر رہی تھی۔ ....

وہ جب اسکول سے لوٹ کر ماں سے روٹی مانگنے کے لئے دوڑتا ہوا باورچی خانے کی سمت جاتا تھا، تب بھی اسی طرح ہاتھ سے دھوئیں کو آنکھوں کے آگے سے ایک طرف ہٹایا کرتا تھا۔

تو ماں کہا کرتی تھی ـــــ ارے کوئی دھواں دینا کوئلہ ہے چولہے میں، اسے دست پناہ سے اٹھا کر باہر پھینک دے۔!

اور اسے چولہے میں سے اٹھتے دھوئیں کے غبار میں، کہیں اِدھر اُدھر پڑا ہوا دست پناہ نہیں ملتا تھا۔۔۔۔

پھر ماں کے پاؤں تلے پڑی ہوئی لکڑی کی چوکی ملتی تھی، اور وہ دھوئیں کے قلب میں بیٹھ کر ہاتھ چلاتے ہوئے دست پناہ تلاش کرتی تھی اور چولہے میں سے دھواں دینے والا کوئلہ بین کر چولہے پر توا رکھ دیا کرتی تھی۔

"کئی برس بھی تو دھوئیں والے بیری کوئلوں سے مماثلت رکھتے ہیں" وہ سوچنے لگا۔

"لیکن وہ دست پناہ؟" دست پناہ کے ساتھ پکڑ کر وہ دھوئیں والے کوئلے نکال دے؟ اسے ہنسی آنے لگی تھی ـــــ وہ تو مجھے اُس وقت بھی نہیں ملتا تھا۔

اُسے لگا۔۔۔۔ وہ زندگی کے اوراق کا بستہ لئے، اب بھی ایک عالمِ بے بسی میں گھرا رہے گا۔ دور کہیں سبز مرچوں اور کچے آموں کی مہک آتی رہے گی اور وہ دھوئیں میں ہاتھ چلاتا، ہمیشہ ہی وہ چہرے تلاش کرتا

رہے گا — جو دھوئیں کے اس پار آباد ہیں۔

کافی گرم تھی، لیکن جس دھوئیں کے ساتھ آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا اُسے اقبال نے انگلی کی نوک سے پونچھ دیا اور کافی کے گرم گھونٹ نے بھی، اس کے جسم میں ایک خنک سی کپکپی اتار دی۔

اس کے بدن پر ابھی تک شب خوابی کا لباس تھا۔ اقبال کا ہاتھ ایک عادت کے مطابق الماری میں لٹکے اس کے اونی ڈریسنگ گاؤن کی طرف بڑھا لیکن ڈریسنگ گاؤن کو پہنتے ہوئے اس کا ہاتھ غیر شعوری طور پر اس کی جیب کے اندر ہی الجھ کر رہ گیا۔

یہ جیب تھی، جس میں ارملا کا ہاتھ تھا۔

اس دن پکنک سے لوٹتے وقت، جب بہت سردی اتر آئی تھی۔

اس دن ارملا کو ہلکا سا بخار آ گیا تھا اور اس کے پاس گرم کپڑا نہیں تھا، اس کی ایک سہیلی نے اپنا کوٹ اتار کر زبردستی اسے پہنا دیا تھا۔ جس کے دائیں جانب والی جیب میں اس نے اپنا داہنا ہاتھ گرم کرنے کے لئے چھپا دیا تھا لیکن اس کے بائیں پہلو میں چلتے اس کے بائیں ہاتھ کو اقبال نے تھام کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔

اور اقبال نے جب اپنے گھر کے قریب کی سڑک پر آ کر اُس طرف مڑنا چاہا تھا ——

—— اچھا اقبال! اس موڑ سے مجھے نزدیک رہے گا، میں ....

اور اُس کی ادھوری بات کو قطع کر کے اقبال نے کہا، "تنہا جاؤں گی؟ اچھا.... " لیکن اس کا ہاتھ اقبال کی جیب میں تھا، جیسے "اچھا" کہہ کر بھی اس نے بدستور تھام رکھا تھا۔

اور وہ اسی طرح کھڑی رہ گئی تھی۔

"جاؤ"

"ہاتھ"

"یہ میری جیب میں رہے گا۔"...

اور وہ کھکھلا کر ہنس پڑی تھی، "اچھا، تو میں ہاتھ کے بغیر چلی جاتی ہوں۔"

"جیب میں ڈالے رہوں گا"....

"کتنی دیر؟"

"—— ہمیشہ"

"—— تو جب کوٹ کو ڈرائی کلین کے لئے دو گے۔"

"—— ڈرائی کلین کے لئے دوں گا ہی نہیں۔"

"—— اور جب کوٹ پرانا ہو جائے گا؟"

"—— یہ پرانا ہو گا ہی نہیں"

"—— اور جب"...

"—— چپ کیوں ہو گئی؟"

"—— برا مانو گے تو نہیں کہہ پاؤں گی۔"

"—— کہہ دو"

"—— جب اس زمیندار کی بیٹی تیری جیب کی مالک بن جائے گی، تب ... ."

زمیندار کی بیٹی کے ساتھ ہونے والے اقبال کے رشتے کی بات ساری ہواؤں میں رچی تھی۔ وہ جانتا تھا لیکن اس نے جیب کے اندر اپنے ہاتھ میں تھاما ارملا کا ہاتھ زور سے بھینچ لیا۔

لیکن یوں، جیسے ایک بار اس نے اپنے ہاتھ کے لئے ارملا کے ہاتھ کا سہارا لیا ہو۔

تو کہا تھا، "وہ میرا خواب نہیں ہے، ارملا"

اُس نے جو کہا۔ سچ کہا تھا، ارملا کے سوا دنیا کی کوئی لڑکی اس کا خواب نہیں تھی۔ زمیندار کی بیٹی تو صرف اس کے ماں باپ کا سپنا تھی۔

ارملا نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔

پھر دھیرے سے کہنے لگی، "بیٹوں کے چہرے میں ماں باپ کی صورت ہوتی ہے نا۔"

"—— کچھ تین نقش ورثے میں ملتے ہیں۔"

"گھر اور زمین بھی ورثے میں ملتے ہیں۔"

اقبال کو اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے اس لئے چپ سا ہو گیا۔ ارملا نے ہی پھر کہا —— "میرا خیال ہے، خواب بھی وراثت میں

ملتے ہیں"

"نہیں!"

اور نہیں کہہ کر وہ ہنس دیا، کہنے لگا "ابھی خوابوں کی وصیت کرنے والے کاغذات نہیں ہوئے"۔

وہ بھی ہنس دی تھی، کہنے لگی، "اس کا جواب دے سکتی ہوں لیکن دوں گی نہیں"

کیوں؟"

وہ پھر ہنس دی، کہنے لگی "کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کو لفظوں کی سزا نہیں دینی چاہئے۔"

اور پاؤں کی طرف بات بھی کھڑی ہو گئی . . . .

پھر جب اس نے جانے کے لئے قدم اٹھایا تو اس کا بازو کھینچ سا گیا

"جاؤ! لیکن یہ ہاتھ یہیں رہے گا، میری جیب میں . . . . منظور؟"

"ہاں منظور . . . . ہاتھ کے بغیر ہی چلی جاؤں گی . . . ."

بہت سے دن اس ایک پل میں سما گئے تھے۔ اقبال نے اپنی جیب میں ارملا کا ہاتھ ڈھانپ کر اور چھپا کر رکھا ہوا تھا . . .

اور زندگی کا ایک ٹکڑا سچ مچ اس کی جیب میں پڑا رہتا تھا۔

پھر جانے کب، کس طرح، وہ کوٹ مر گیا . . . .

اور وہ کوٹ مر کے، اس کے بیاہ کے جامے کی جون اختیار کر گیا۔

زمیندار کے گھر کی دولت پاؤں کے آگے بچھ گئی لیکن اقبال نے جیب میں

ہاتھ ڈالے تو جیب ہاتھ سے خالی تھی۔

خالی جیب نے اقبال کی طرف دیکھا۔

میں نے اس ہاتھ کا سودا کر لیا۔

اس نے سرگوشیوں کے درمیان جیب سے کہا!

جیب نے حیراں ہو کر اس کو دیکھا، جیسے وہ نیچے تک اپنی روح کی سرحدوں تک، اپنے خالی پن کو دکھاتا ہوا پوچھ رہا ہو "کس قیمت کے عوض سودا ہوا۔"

اقبال کھکھلا کر ہنسا، جیسے آنکھوں میں بھر آئے۔ آنسوؤں کو روک لینا چاہتا ہو۔ کہنے لگا "کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو لفظوں کی سزا نہیں دینی چاہیے۔"

۵

ٹیلی فون کی گھنٹی گنگنائی

اقبال نے چونک کر اس سیاہ فام مشینی تماشے کو دیکھا۔ جو اس کے ارد گرد کی دنیا نے، اس کی خواب گاہ کے اندر تک، ایک لمبے ہاتھ کی طرح رکھا ہوا تھا۔

گھنٹی پھر گنگنائی۔

اقبال نے ٹیلی فون کے تار کی طرف گھبرا کر دیکھا، جیسے وہ مہینے بھر کا لمبا بازو ہو، اور جس کا ہاتھ اس کی چھاتی کے اندر تک پہنچ رہا ہو۔۔۔

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

جیسے دیوار کو کوئی لگاتار چھیدے چلا جا رہا ہو۔

کوئی ہتھوڑی جیسے ایک تال میں گرفتار ہو۔

اس کا ہاتھ گھبراہٹ میں ریسیور کی جانب سرکا۔۔۔ آواز کو معطل کر دینے کے لئے۔

وہ آواز ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گئی لیکن ایک آہستہ اور دھیمی سی آواز سرک کر اس کی طرف بڑھی۔

—— مسٹر اقبال

—— ہاں

—— میں پوری بول رہا ہوں، بھابی نے جانا تھا، چلی گئی۔

—— ہاں

—— پھر دوپہر کے کھانے پر میں تمہارا انتظار کروں گا۔

اقبال کو لگا جیسے ایک دن کی مہلت بھی غیر قانونی ہو اور کوئی ہاتھ میں سرچ لائٹ تھامے، اسے ایک دن کی گپھا میں بیٹھے ہوئے تلاش کر رہا ہو۔

ہیلو، ہیلو۔۔۔ آواز نہیں آ رہی۔

نہیں پوری —— میں دوپہر کے کھانے پر کہیں اور مدعو ہوں۔

تو رات کو سہی، ڈنر میرے ساتھ۔

نہیں.... عشائیہ بھی کہیں اور قبول کر چکا ہوں۔

ٹیلی فون کے تار میں سے گزرتا قہقہہ سا اقبال کے کانوں میں گونجا

"پھر تو معاملہ انتہائی سنجیدہ معلوم ہوتا ہے"

—— نہیں پوری....

بھابی آئیں گی تو ساری رپورٹ تیار رکھوں گا، سچ بتاؤ، کس لڑکی کے ساتھ دوپہر کے کھانے کا وعدہ ہے۔

پوری کے گمان کا اس نے پوری ہی کے گمان میں جواب دیا۔

"ہاں اور ڈنر بھی اسی کے ساتھ؟

—— ہاں

ٹیلی فون کا تار زور سے ہنسا۔ "یار! اب ہمارے وطن سے رخصت ہوتے ہوئے، کیا ہمارے ہاں کی ایک لڑکی کو رونے کے لئے چھوڑ جاؤ گے.....

—— تم عجیب ہو پوری!

—— کیوں؟

ابھی تم کسی بھابی کے ہمدرد بن رہے تھے اور اب تمہیں کسی اور کی دردمندی نے پکارا ہے۔

یار! فلور گراسنگ تو ہمارے بڑے بڑے لیڈر تک کر لیتے

ہیں.....

اچھا ——— اس ایک دن کی ملکہ کو ہمارا سلام کہنا.....

اقبال نے کھینچ کر فون کا پلگ اتار دیا۔

اسے ایک گونہ تسلی ہوئی ——— کہ اب باہر کی کوئی آواز اندر نہیں آسکے گی۔

لیکن ٹوٹی چپ بھی پھر سے جڑنے لگی تو اسے خیال آیا۔ "میں نے پوری کے آگے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ آج دوپہر کا کھانا کسی لڑکی کے ساتھ ہے اور ساتھ ہی اسے لگا " یہ پورا جھوٹ نہیں... دور سے دیکھو تو جھوٹ لگتا ہے لیکن قریب سے دیکھو.... تو یہ جھوٹ نہیں۔

آج کافی پیتے وقت ارملا اس کے ساتھ تھی۔

اور دوپہر کے کھانے پر بھی

اقبال کو لگا ——— جیسے آج وہ سچ اور جھوٹ کے درمیان کہیں معلق ہو....

یہ پتہ نہیں کون سی جگہ ہے ——— ایک نئی جگہ، سچ اور جھوٹ کے مابین....

اس جگہ کی بات اس نے ایک بار سنی تھی.....

ارملا نے سنائی تھی، جب کالج میں ایک مباحثہ ہوا تھا....

کچھ بیتے ہوئے پل دھیرے سے سرک کر کمرے میں در آئے۔

مباحثہ کا موضوع ہے۔ "قوتِ ارادی" (WILL POWER)

—— ارملا! تم قوت ارادی کی حمایت میں بولوگی، میں بھی حمایت ہی میں بول رہا ہوں....

—— نہیں، میں حمایت میں نہیں بولوں گی۔

—— کیوں؟

کیونکہ اس کے پاس تمہارے جیسا کامل وکیل ہے، اسے میری ضرورت نہیں۔

—— یہ مذاق کیوں؟

—— مذاق نہیں

مذاق ہی تو تھا۔ ارملا نے اپنی قوتِ ارادی سے کیا نہیں کیا؟ ننہالی گھرانے کے رحم وکرم پر پل رہی ہے، اور کسی کی مرضی کے خلاف کالج میں پڑھ رہی ہے۔ فیسوں کا بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوا تو اس نے اسکالرشپ لے کر اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا پھر.... پھر ارملا اس طرح کیوں کہہ رہی ہے

کالج کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے!

مباحثے کے ترازو کا ایک پلڑا بھاری ہو رہا ہے، قوت ارادی کی حمایت کرنے والے بہت مشکل میں ہیں، اُن کی دلیلیں جوانی کے گرم لہو میں بھیگی ہوئی ہیں، اور ان کی کسی ہوئی باہیں سیدھا مستقبل کے سینے کو چھوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔

اقبال سوچ رہا ہے۔ ارملا جان بوجھ کر ایک اداس اور

شکست خوردہ حزب میں کیوں جا بیٹھی ہے؟ کیوں؟

لیکن ارملا کے چہرے پر اداسی نہیں، صرف سنجیدگی ہے — اور اسٹیج پر جا کر بولنے والے ہر مقرر کو سنتے ہوئے، سننے والوں کی تالیوں کے ساتھ اپنی تالی بھی ملا دیتی ہے۔ جیسے اپنے خلاف بولنے والوں کو داد دے رہی ہو۔

یہ ارملا آج اپنے خلاف کیوں ہو رہی ہے؟

اقبال نے کل لائبریری میں بیٹھ کر — انسان کے من کی طاقت کے موضوع پر کتنے ہی حوالے جمع کئے تھے جنھیں ایک ایک کر کے اسٹیج پر دوہرا رہا تھا — اور پھولوں سے لدی میز کے پیچھے رکھی کرسیوں پر بیٹھے تینوں منصف اسے سنتے ہوئے —— کاغذوں پر کچھ نوٹ کرتے جا رہے ہیں.... اور سامعین تالیوں سے کمرے کی خاموشی کو بار بار توڑ دیتے ہیں..... اور ارملا بھی.....

کمرے میں ایک ایقان سا پھیل گیا ہے کہ آج کے مباحثے کی کامیابی کا چمکدار اعزاز اقبال اور اس کے ہم خیالوں کے ہاتھ چومنے والا ہے۔

اب ارملا کی باری ہے۔

کمرے میں چپ کے ساتھ ایک سنسناہٹ سی بھی محسوس ہو رہی ہے جیسے کمرے کی تیز روشنیاں اچانک مدھم ہو گئی ہوں۔

ارملا کی آواز آ رہی ہے —— دیواروں سے ٹکرا کے گونجتی نہیں، صرف کانوں کو چھو کر ہوا کی طرح سرسراتی ہوئی سی ——

ابھی، یہاں، اسی مقام پر کھڑے ہو کر جو لوگ بھی بولتے رہے وہ مجھے زندگی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں جیسے لگے۔

ارملا آخر کیا کہنا چاہتی ہے؟ اقبال حیران ہے۔ یوں کھڑی ہے جیسے اپنے خلاف گواہی دینے کے لئے حاضر ہوئی ہو۔

لیکن ارملا اس کی جانب نہیں دیکھ رہی ہے.... سامنے خلا میں گھور رہی ہے..... کہہ رہی ہے ——— انھوں نے جو کچھ کہا، سچ ہے لیکن پورا سچ نہیں.... اور یہ ادھورا سچ بہت خطرناک ہوتا ہے۔

کمرے کی ہوا جیسے اپنی سانسوں کو ضبط میں لانے کی کوشش کر رہی ہے۔

ارملا کہہ رہی ہے ——— "دنیا کتنے ملکوں میں تقسیم ہے، سوال یہ نہیں، سوال یہ ہے کہ دنیا صرف دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک ٹکڑا وہ ہے جو حکومت کرتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو محکوم ہے۔

ارملا، لفظوں سے راستہ تراشتی کہہ رہی ہے.... کہ دونوں میں سے آزادی کسی کو نصیب نہیں، بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ یہ مالک اور غلام کا رشتہ ہے، جس میں غلام آزاد نہیں لیکن مالک آزاد ہے... اور مالک کی یہی آزادی ایک ادھوری سچائی ہے..... مالک اپنے غلام کا سب سے زیادہ محتاج ہے۔ کیونکہ وہ صرف غلام کا وجود بن کر رہ جاتا ہے جو اُسے مالک ہونے کی حیثیت دے سکتا ہے.... اگر رعایا ہی نہ ہو تو کوئی حکمراں کیسے بنے؟

سو حکمران اپنی رعایا کا سب سے بڑا محتاج ہوتا ہے۔

آواز کانوں کو چھو کر نہ معلوم کیوں دور نہیں جا رہی ... اس میں کوئی بھاری پن ہے، جو کانوں سے ٹکرا رہا ہے۔ کانوں کو جھنجھوڑ رہا ہے۔

جس طرح آزادی، کئی جگہوں پر اپنے ہونے کا فریب نہیں دیتی لیکن کئی جگہوں پر اپنے ہونے کا دھوکہ دیتی ہے، اُسی طرح قوتِ ارادی بھی کئی جگہوں پر اپنے ہونے کا افسوں بنتی ہے ... انسان کو منقلب کرنے کا .... سماج کو بدلنے کا، سیاست کو تہہ و بالا کرنے کا۔

ویسے میرا کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ فریب نہیں دیا جانا چاہیئے۔

ہال میں کرسیوں پر ہلکی ہلکی ہنسی کی رم جھم ہوئی اور پھر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

ارملا کہہ رہی ہے، " ایک بہت خوب صورت نظم کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ دور چمکتی ریت کو سراب سمجھ کر ریت میں نہیں دوڑتے۔ وہ ضرور دانش مند ہوں گے لیکن میں انھیں سلام کرتی ہوں۔ جو ریت کو سراب جانتے ہیں اور پانی کا ایک گھونٹ لینے کے لئے ساری زندگی ریت میں دوڑتے رہتے ہیں....

اور ارملا، ایک شگفتہ سی آواز میں کہہ رہی ہے — ایک شاعر کا یہ سلام اصل میں سراب کو نہیں، انسان کی پیاس کے نام ہے اور پیاس کا دوسرا نام زندگی ہے۔

ہال میں بیٹھے سبھی لوگوں کے چہرے کچھ کھنچ سے گئے، جیسے سوچ میں

پڑ گئے ہوں۔

ارملا لڑکے استقلال سے کہہ رہی تھی، "کسی سچائی کے وجود اور ظہور کے مابین وہ فاصلہ ہوتا ہے جو ابھی تک انسان طے نہیں کر سکا۔ جیسے کھنڈروں میں سے کئی بار بیتی ہوئی تہذیبوں کے نشان برآمد ہو جاتے ہیں، اسی طرح کسی دستاویز میں سے کئی بار تاریخ کی بیتی ہوئی سچائی کے ٹکڑے مل جایا کرتے ہیں اور کل کے فکری سوتے آج کی سوچ کے آگے ماخذ پڑ جاتے ہیں — دیکھا جائے تو یہ سرزمین مجبوریوں کی ایک طویل تاریخ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔

پھولوں سے لدی میزوں کے پاس تینوں کرسیوں پر بیٹھے جج کچھ حیران سے ہو کر ارملا کی طرف دیکھ رہے ہیں، اس نگاہ میں ایک اچٹتی ہوئی بے چینی بھی ہے۔

لیکن ارملا کی آواز پرسکون ہے۔ "ہاں قوتِ ارادی صرف اس قدر کام آتی ہے کہ انسان اپنے درد کو اپنی زبان پر لا سکنے کے بجائے اپنے ہونٹوں سے پونچھ سکتا ہے، اسے اندر اپنے حلق میں اتار سکتا ہے، اس سے آگے جو کچھ ہے وہ پیاس کا معجزہ ہے پانی کا نہیں..... اور پیاس کو جگائے رکھنے کے لئے اُس جگہ پر کھڑا رہنا ضروری ہے، جو سچائی اور جھوٹ کے مابین واقع ہے، کیونکہ دنیا کے سب فیصلے صرف اسی جگہ قیام پذیر ہو سکتے ہیں۔ قوتِ ارادی کے ذریعے کچھ بن سکتے اور کچھ انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ بھی صرف اسی جگہ ہو سکتا ہے۔

ہال میں جو بیٹھے ہوئے تھے ـــــ اُن سب کو جیسے کچھ سنگھا دیا گیا تھا کچھ اس طرح کہ تعریف کی غرض سے تالیاں پیٹنے کے لئے اٹھے کچھ ہاتھ فضا ہی میں معلق ہو کر رہ گئے۔

ارملا دھیمے سے مسکرائی ہے اور کہہ رہی ہے ـــ شاید اپنے لفظوں میں میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتی۔ اس لئے ایک چیک[1] کہانی سناتی ہوں کہ اک کنگر نام کا آدمی تھا۔ قتل کے کتنے ہی مقدموں میں ملوث کنگر۔ سی آئی اور پولیس ہمیشہ اس کا پیچھا کرتی تھی۔

لیکن جب اس نے نواں قتل کیا جس میں اس نے اپنے تحفظ کے لئے ایک پولیس والے پر گولی چلائی تھی تو وہ پولیس والا مرتے مرتے بھی اس پر سات گولیاں داغ گیا جس سے کنگر کی موت واقع ہو گئی۔

خیر ـــــ وہ دوسری دنیا میں پہنچا، عدم آباد میں جہاں تین ججوں کی خصوصی عدالت میں اُس کی پیشی ہوئی۔

سننے والوں کی کہانی میں گرفتار سماعت دم بھر کے لئے اچٹی۔ اسٹیج پر بیٹھے تینوں ججوں کو دیکھ کر ہوا جیسے مسکرا پڑی ہو۔ لیکن ارملا کسی کی سماعت کو اچٹنے کا موقع نہیں دے رہی۔

کہہ رہی ہے ـــــ میز پر اسی طرح کی فائلیں تھیں جس طرح ہماری دنیا میں، ہماری عدالتوں کے بیچ ہوا کرتی ہیں ـــــ کہ فرڈینینڈ کنگر، بیروزگار

---

[1] چیکوسلواکیہ کی کہانی

5447
Hardayal Municipal Public Library, Delhi
Acc No. 19395 1986

فلاں تاریخ کو پیدا ہوا ـــــ فلاں تاریخ ـــــ ہاں ان فائلوں میں اس کی موت کی تاریخ بھی درج تھی۔

چیف جج نے ہماری عدالتوں کے جج کی طرح سرد لہجے میں پوچھا ـــــ کنگلر! تم اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے ہو یا بے خطا؟

کنگلر نے کہا "بے قصور"

اور جج کے حکم پر اس کی گواہی طلب کی گئی۔

کمرے میں گواہ حاضر ہوا۔ عجیب و غریب صورت ـــ عمر رسیدہ، تنے ہوئے شانے، پرجلال چہرا، اور ان کے بدن پر سجے نیلے جبے پر بڑے چمکدار ستارے جڑے ہوئے۔

کنگلر حیران ہو کر گواہ کے جلال کا نظارہ کرنے لگا اور وہ اور بھی حیران ہوا کہ تینوں جج اس کے خیر مقدم کو ایستادہ ہوئے تھے، خیر، گواہ کرسی پر بیٹھ گیا اور جج بھی اپنی اپنی مسندوں پر متمکن ہو گئے۔

پھر چیف جج کہنے لگا، "گواہ! تم سب کچھ جانتے ہو، اے علیم! تم لامتناہی صدق ہو، اس لئے تمہیں سوگند اٹھانے کی ضرورت نہیں کہ تم جو کچھ کہو گے سچ کہو گے.... اس لئے اب مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوتا ہے۔

اور چیف جج نے کنگلر سے کہا "ملزم کسی بات سے منحرف ہونے کی کوشش نہیں کرو گے کیوں کہ گواہ سب کچھ جانتا ہے وہ علیم بذاتِ الصدور ہے۔

خیر جج نے چشمہ لگایا اور اطمینان سے کرسی کی پشت پر ٹک گیا۔
یہ جو گواہ تھا اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا، "یہ کسگر بچپن سے ہی ایک اکھڑ اور بدمزاج لڑکا تھا، وہ اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا لیکن ماں کاموں میں مصروف رہتی اور یہ لڑکا ماں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے دن بدن ضدی بنتا گیا اتنا کہ ایک بار اس کے باپ نے اسے تھپڑ مارنے کی کوشش کی تو اس نے باپ کے انگوٹھے کو دانتوں کی پوری طاقت سے چبا کر زخمی کر دیا....

اور گواہ نے کسگر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پھر تم نے پہلی چوری کی، تم نے کسی کے باغیچے میں سے گلاب کا پھول چرایا۔

"ہاں میں نے ایک لڑکی ارما کے لئے پھول چرایا تھا" کسگر نے کہا

گواہ ہنس پڑا، کہنے لگا "مجھے معلوم ہے، ارما اس وقت سات برس کی تھی لیکن کیا تو یہ جانتا ہے کہ پھر ارما پر کیا گزری؟

کسگر حیران ہو کر گواہ کو تکنے لگا، کہنے لگا۔ "میں نے کئی بار اس کے بارے میں سوچا لیکن مجھے پھر پتہ ہی نہ چل سکا کہ ارما کہاں ہے۔

گواہ نے بتایا کہ ارما کا ایک بیمار آدمی سے بیاہ کر دیا گیا، اور دکھوں کے بوجھ تلے کچھ دنوں بعد وہ ہلاک ہو گئی۔

کسگر حیران ہو کر گواہ کا منہ تکنے لگا۔ ایک جج نے کچھ عجلت میں پڑ کر گواہ سے پوچھا۔

"اے خداوندِ عالم! تم سب کچھ جانتے ہو لیکن ان تجزیوں کی ہمیں

ضرورت نہیں، تم صرف کنگلر کے گناہوں کی بابت بیان دو"
سو کنگلر نے جانا۔ کہ خداوند اس کا گواہ ہے۔
ہال میں بیٹھے سارے لوگ بت بن گئے تھے، جج بھی، اور ارملا کی کہانی آگے بڑھ رہی تھی۔
گواہ ہنس سا پڑا اور بتانے لگا کہ کنگلر کی دوستی ایک بوڑھے شرابی سے ہوگئی۔ جو وقت بے وقت کنگلر کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔
کنگلر سے رہا نہ گیا، بیچ میں بول پڑا، "پر اُس کی بیٹی میری کا کیا ہوا؟
خدا نے بتایا "میری مشکل سے ابھی چودہ برس کی تھی، جب اس کی شادی جبراً کر دی گئی اور بیسویں برس میں وہ مر گئی..... مرتے وقت تجھے بہت یاد کرتی رہی۔
کنگلر نے بہت اداس ہو کر خدا سے پوچھا۔
میں تو چودہ برس کی عمر میں گھر سے بھاگ گیا تھا، میری ماں پر کیا بیتی؟
میری بہن کا کیا ہوا اور بوڑھے باپ کا؟
خدا نے بتایا "اندیشوں نے تیرے باپ کی جان لے لی، اور ماں کی آنکھیں رو رو کر بہہ گئیں تو وہ بینائی کھو بیٹھی، مفلسی نے تیری بہن کی شادی ہی نہ ہونے دی، اس لئے وہ لوگوں کے کپڑے سی کر گزارہ کرتی رہی۔
چیف جج نے حلیمی سے اعتراض کیا، "اے خداوند عالم! مقدمے کی کارروائی ضروری ہے۔ یہ بتاؤ کہ ملزم نے کتنے قتل کئے ہیں۔
اور گواہ بتانے لگا۔" اس نے تو قتل کئے ہیں۔ پہلی بار دنگے فساد کے

دوران اس کے ہاتھوں انجانے میں ایک قتل کی خطا ہوئی جس کے لئے اُسے جیل بھیجا گیا تھا۔ یہ جیل میں بے حد بگڑ گیا۔ باہر آکر اس نے دوسرا قتل اپنی بے وفا محبوبہ کا کیا، اور تیسری چوری کرنے کے بعد اس بوڑھے آدمی کا جس کے ہاں اس نے نقب لگائی تھی اور چوتھا، رات کے ایک پہرہ دار کا، پانچواں اور چھٹا ایک بوڑھے اور اس کی بیوی کا، جن کے ہاں چوری میں اسے سولہ ڈالر ملے تھے، حالاں کہ اُن کے پاس بیس ہزار ڈالر تھے۔

گنگلر نے حیران ہو کر پوچھا "بیس ہزار ڈالر، کہاں تھے وہ ...."

خدا نے بتایا "اُس چٹائی میں جس پر وہ سو رہے تھے"۔ اور کہا، "ساتواں قتل اس نے امریکا میں اپنے ایک ہم وطن کا کیا اور آٹھواں ایک راہ گیر کا، جو پولیس سے بھاگتے ہوئے، اس کے راستے میں آگیا تھا اور نواں قتل اُس پولیس والے کا جس نے اس پر گولیاں برسائیں اور اس نے اس پر....."

"ملزم نے اتنے قتل کیوں کئے" ایک جج نے سوال کیا۔

پھر خدا گنگلر کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا، کچھ پیسوں کی خاطر، کچھ غصے میں آکر، کچھ اتفاقاً.... خیر، یہ فراخ دل بھی تھا، گاہے گاہے لوگوں کی مدد کرتا تھا، بڑا شائستہ مزاج تھا۔ اس لئے عورتوں پر بہت مہربان تھا .... اپنے قول کا بھی پکا تھا، جو کسی سے وعدہ کیا کرتا تھا ہمیشہ....

ایک جج نے خدا کو ٹوکا کہ اس تجزیے کی ضرورت نہیں اور پھر تینوں جج گنگلر کی فائل پر غور کرنے کے لئے برابر کے کمرے میں چلے گئے۔

اب کنگرا اور خدا کمرے میں اکیلے رہ گئے تو کنگر نے حیران ہو کر خدا سے کہا کہ میرا خیال تھا۔ اس دوسری دنیا میں سارے فیصلے تم خود سناتے ہو گے لیکن یہاں بھی یہی لوگ فیصلے کرتے اور سناتے ہیں ۔ ۔۔۔ ایسا کیوں؟

تو خدا کچھ اداس ہو کر کہنے لگا ___ ہاں کنگر! انسان کے کاموں کا فیصلہ انسان ہی کر سکتے ہیں ۔۔۔ میں پوری سچائی سے آگاہ ہوں اور جب پوری سچائی جان لی جائے تو اس وقت کسی کی خوبیوں اور خامیوں کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انسان ادھورا سچ جانتے ہیں اور اسی لئے سزا کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

ارملا نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا ہے ___ اتنا ٹھنڈا کہ سارے ہال پر ہلکی سی کپکپی طاری ہو گئی ہے

کہہ رہی ہے ___ "ہم ادھورے سچ کے قابل ہیں، ہم اپنی قوتِ ارادی سے دنیا بدل سکتے ہیں ___ یہ ایک خوب صورت فریب ہے جو صرف ادھورے سچ سے ہی قائم رکھا جا سکتا ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتی کہ فریب نہ دیا جائے ۔۔۔ کیوں کہ فریب کے بغیر زندگی کو بتایا نہیں جا سکتا ۔۔۔ صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اس نوع کے فریبوں کو حتمی سچ قرار دینا انسان کی کوئی جیت نہیں۔

اور ارملا اسٹیج سے اتر رہی ہے ۔۔۔۔

ہال میں بیٹھے سارے لوگ ہاتھ ہلانا بھول گئے ہیں اور کرسیوں

سے اٹھنا بھی۔

تینوں کرسیوں پر بیٹھے جج پل بھر کے لئے کرسیوں کے وجود سے ہی غافل ہو گئے ہیں۔ ایک نے آہستہ سے دائیں آنکھ کے قریب بہتے پانی کو انگلی سے پونچھا ہے اور زندگی کا تقاضہ اچانک ایک وجود اختیار کر گیا ہے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج رہا ہے.... ججوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ہے پھر ایک نے اٹھ کر اسٹیج سے اتر کر ادھر چلی گئی ارملا کا نام پکارا ہے...

ایک نام ہال میں گونج کر — کھلے دروازے میں سے باہر چلا گیا ہے

دور وادیوں میں
کچھ پہاڑیوں کے پیچھے
وقت کے بہتے دھارے کے اس پار
اقبال کمرے میں سن ہو کر رہ گیا ہے....
بیتا ہوا وقت کچھ لمحوں کے لئے، کمرے میں آیا اور لوٹ گیا
شاید اس کھڑکی میں سے داخل ہوا تھا — اقبال نے متحیر آنکھوں سے آس پاس نگاہ ڈالی — بند کمرے کی وہ ایک کھڑکی جو اس نے صبح کی روشنی سے کھولی تھی....

⑥

اقبال نے کافی کا ایک گرم پیالہ تیار کیا اور باورچی خانے کے اونچے اسٹول پر بیٹھ کر سامنے پتھر کی سلیب پر پیالہ رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

ایک وقت تھا جو میرا ہو سکتا تھا۔

میرے ساتھ قدم قدم چلتا، اس لمحے۔ یہاں اس کمرے میں آسکتا تھا

کافی کے ایک پیالے جیسی حقیقت ..

روٹی کے ایک ٹکڑے جیسی حقیقت ....

لیکن وہ وقت ——————

کسی ندی میں گر کر بہہ گیا... پانی کی طرح....

یا شاید زمین پر گر کر پتھر ہو گیا ....

اور اقبال کا کافی کے پیالے کی طرف پھیلا ہوا ہاتھ بھی ٹھہرے ہوئے وقت کی طرح کا سا ہو گیا۔

ہاتھوں میں کچھ پھول تھے، اور ہاتھ ارملا کی جانب بڑھا ہوا....

اُرمی کے گھر کی طرف مڑنے والے مندر کی دیوار کے پاس ۔

اور کچھ آوازیں تھیں، جو ابھی بھی وہاں ہوا میں معلق تھیں۔

اقبال، تم ... یہاں ؟

تمہیں یہ پھول پیش کرنے کے لئے۔

— شکست کے فلسفہ کو پھول پیش کئے جاتے ہیں ؟
— سچ کے ادھورے پن کو دیکھنا شکست کا فلسفہ نہیں
— لیکن اسے فتح سے بھی نسبت نہیں دے سکتے ۔
— جیت اور ہار کو ملکوں کے بیچ جنگوں کے لئے رہنے دو...
— پھر ؟
— صرف یہ جاننا چاہتا ہوں
— کیا ؟
— کہ اس عمر میں، عمر سے اس طرف جو کچھ ہوتا ہے، تم نے وہ کس طرح دیکھا ہے ؟
— ہوا میں ایک گونہ تبسم بھی ٹھہرا ہوا ہے ....
— اور ٹھہرے ہوئے وقت کے پاس کھڑا ہوا اقبال ابھی بھی اسے سن رہا ہے ....
— اقبال! تم نے کبھی وہ لوگ دیکھے ہیں جو خود اپنے جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں ؟
— نہیں ارملا
— میں نے انھیں دیکھا ہے... شاید اسی لئے، جو کچھ عمر کے اُس طرف ہے، وہ دیکھ سکتی ہوں ۔
— وہ لوگ ؟
— تاریخ ان لوگوں کے وجود سے مزین ہے.... نہیں یہ تاریخ

نہیں جو ہم اسکول یا کالج میں پڑھتے ہیں.....

—— کھنڈروں میں مدفون تاریخ....

—— ہاں، چپ کے کھنڈروں میں گرا ہوا... اس کا کوئی کوئی ٹکڑا سا کبھی کھدائی کے دوران برآمد ہو جاتا ہے... اسے بھی لوگ کبھی ضبط کر لیتے ہیں۔ پر کبھی ہوا کے دوش پر اڑتا اچانک نظر آجاتا ہے.... میں نے گزشتہ روز ایک ضبط شدہ کتاب پڑھی تھی....

—— ضبط شدہ کتاب؟

—— ایک جیل کے قیدی کی خود نوشت۔

—— بہت بھیانک ہوگی....

—— ہاں بہت بھیانک.... اس میں میری عمر کی کئی لڑکیوں کی سرگزشت بھی تھی۔

—— جیل میں سڑتی ہوئی لڑکیوں کی؟

—— صرف جیلوں میں عام قیدیوں کی طرح نہیں... اور سیاسی قیدیوں کی طرح نہیں، وہ عام قسم کے تھے جن کے پاس صرف ایک چھوٹے سے گھر کا خواب ہوتا ہے... مختصر سے روزگار کا، اور عزت کی روٹی کھانے کا....

لیکن وہ جیلوں میں؟

میں نے کہا تھا نہ کہ دنیا دو حصوں میں بٹی رہتی ہے....

ایک کو حکم دینے کا حق ہوتا ہے، دوسرے کو لینے کا... جن افسروں

کی نظروں میں وہ گھب گئیں.... انھوں نے اُن کی حکم عدولی کر دی
اور ہوا میں ٹھہرا ہوا قہقہہ اقبال کی سماعت کو چھوتا رہا۔
عام لڑکیوں کی عام سا گھر بسانے کی قوت ارادی

تو افسروں نے ان کو سیاست کے جال میں پھنسا کر جیلوں میں ڈلوا دیا... صرف اتنا ہی نہیں، جیلوں کے داروغوں کو حکم ملا کہ اُن کو جیل کے افسروں کی شہوت زدگی کی غذا بنایا جائے۔

اقبال! کچھ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنا جنازہ آپ دیکھتے ہیں...

—— لیکن ارملا

—— تم کہو گے — میں ان لڑکیوں میں صورت کیوں دیکھتی ہوں؟ وہ وہ تمھیں میں نہیں....

اور ہوا میں ابھی تک ارملا کی آواز کی طرح اقبال کی چپ بھی معلق ہے.... ارملا کی آواز ہے۔ میں نے ان کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن اُن جیسی اپنی ماں کو ضرور دیکھا ہے...

—— ماں کو؟

—— ماں جب کنواری تھی، اس پر کوئی فریفتہ ہو گیا تھا، بڑے متمول گھرانے کا آدمی، وہ اس گاؤں کا راجہ کہلواتا تھا.... اور ماں نے بھی وہی جرم کیا جو اس حیثیت کے لوگوں کو نہیں کرنا چاہئے، ضد پر اڑ گئی کہ وہ مر کر بھی اس گھر میں نہیں جائے گی... ماں کی آنکھوں میں بھی

ایک چھوٹے سے گھر کا خواب تھا... .

—— وہ خواب ؟

—— پورا ہوا، لیکن ایک قرض کی طرح

—— قرض کی طرح ؟

—— ہاں گھر بنا، پسند کا شوہر بھی ملا اور ایک بچہ بھی... یعنی میں... لیکن اس دنیا کا قرض بڑھتا گیا۔

—— ارملا !

جگ بیتی نہیں، آپ بیتی کہہ رہی ہوں... میں سات برسوں کی تھی اس لئے جو آنکھوں دیکھا تھا وہ آنکھوں ہی میں پڑا رہے گا.... اُس وقت جب قرض خواہ سطالبہ لے کر آئے تھے۔ بہانہ بنا کر آئے تھے کہ میرے باپ کو گھوڑے سے گرا کر سخت چوٹیں آئی ہیں اور ماں اُن کے زخموں کی تکلیف پر چیخ کر ان لوگوں کے ساتھ چل پڑی تھی....

—— یہ اُسی گاؤں کے راجہ کہلوانے والے کا انتقام تھا ؟

—— ہاں، یہ انتقام اس نے اپنی حویلی میں بیٹھ کر لیا

اور ماں ؟

جب نصف شب کو حویلی سے باہر نکالی گئی... عام عورتوں کا ردعمل بھی بالکل عمومی سا ہوتا ہے اقبال !.... وہ ایک ٹوٹا ہوا خواب لے کر ایک ثابت گھر میں واپس نہیں جا سکتی تھی —— ندی میں ڈوب کر سرخرو ہو گئی — وہ اکیلی ہی اپنے جنازے کے ساتھ چلی گئی....

وہاں ـــ مندر کی دیوار کے پاس، اقبال کی ایک خاموشی ہے، جو پتھر بن کے زمین پر گری تھی اور ابھی تک وہیں ایک پتھر کی طرح پڑی ہے ..... ارملا کی آواز بھی وہیں مقیم ہے ....

ـــــ پھر میں نے اپنے باپ کو اپنے جنازے کے ساتھ جاتے دیکھا .... انتقام کی کوئی دوسری راہ اُس کے علم میں نہیں تھی، اور نہ ہی وہ بدلہ لے سکا۔ لیکن ایک بدلہ اُس کے بس میں تھا، جس دنیا نے اس کی عورت چھین لی تھی، اس نے اس دنیا سے اپنی پیٹھ پھیر لی ....

سادھو ہو کر اس نے دنیا ترک دی

ـــــ وہ زندہ ہیں ؟

ـــــ زندگی اور موت کا رشتہ ٹھکانے کے علم سے ہوتا ہے ... اگر ٹھکانے کا علم نہ ہو تو دونوں تصور ایک جیسے ہیں۔

ـــــ ارملا ...

ـــــ اسی لئے اپنی عمر سے بہت آگے نکل آئی ہوں اقبال

ـــــ اور اب امیدوں اور خوابوں جیسی کیفیتوں کی سمت واپس نہیں مڑا جا سکتا۔

شاید اقبال کا ہاتھ کپکپایا، یا کافی کا کپ اپنے آپ کانپ گیا، وہ سلیب سے نیچے گر کر کئی ٹکڑوں میں بکھر گیا۔

وہ وقت اب کہیں نہیں ... اقبال کے ماتھے کی ایک شریان

اپنے خون میں کسمساتی ہوئی درد کی ٹیس بن گئی "میں بہت دور آگیا ہوں.... لوٹ کے اُس وقت کی جانب نہیں جا سکتا۔

آنکھوں کے آگے جیسے مندر کی دیوار ڈھے گئی ہو....

صرف ملبہ رہ گیا....

اقبال باورچی خانے کے اسٹول سے اٹھا ـــــ جیسے کوئی آدمی بے صورت سا ملبے کے نیچے سے برآمد ہوا ہو۔

۷

پاؤں ایک عادت کے اسیر، اسے خواب گاہ میں لے گئے لیکن بدن میں عجیب سی تھکن تھی... قدم ڈگمگاتے ہوئے، وہ اپنے پلنگ کے پاس آکر ایک ہاتھ اس کے بازوؤں پر ٹکاتا، بیٹھ گیا۔

کسی نے ایک ملبے کا ڈھیر سا، جیسے اس دور کی جگہ سے اٹھوا کر اِدھر اس جگہ رکھوا دیا ہو۔

اک گہرا اور کٹھن سا سانس لیتے ہوئے، اقبال کو اپنے آپ پر حیرانی سی ہوئی۔ ارملا کی ماں ندی میں ڈوب گئی تھی۔ مجھے اس بات کا پتہ تھا ـــ مگر آج کیوں کچھ یوں محسوس ہوا جیسے یہ بہت بھیانک بات ....اب اچانک معلوم ہوئی ہو۔

یوں، جیسے آج اقبال نے ندی میں بہتی اس کی لاش دیکھی ہو۔

پلنگ کے پاس دھری کانچ کی صراحی میں سے اقبال نے پانی پیا تو پاؤں کے تلووں تک ایک ٹھنڈی سی کسک اترتی چلی گئی۔

آج سب کچھ جیسے دوسری بار دوہرایا جا رہا ہو۔

جیسے یہ وقت دنیا پر صرف دو بار آیا ہو

نہیں، شاید وقت ایک گپھا کی طرح وہیں رکا ہوا ہے۔ اور وہ اس گپھا سے صرف دوسری بار گزر رہا ہے۔

آج .... آج ارملا اس سے دوسری بار چھن رہی ہے۔

اقبال نے اپنے آپ کو دیوانگی کی گہری کھڈ میں اترے دیکھا۔

کچھ دکھائی نہیں دیا، صرف اندھیرا ....

دھرتی کو کھود کر جیسے اندھیرا ایک گہرائی میں چھپا

دل کے پتھروں کو پھاڑتی ہوئی سی چیخ کے ساتھ اقبال نے اپنے پاؤں کو سنبھالا دیا۔

اپنا ہاتھ تھام کر وہ کھائی میں سے کچھ باہر آیا اور اپنے تصور کو سنبھالا دینے کے لیے کمرے کی دیواروں کی طرف اور کتابوں کی طرف دیکھنے لگا۔

الماری میں سے ایک کتاب نکالی، رکھی، دوسری کو تھاما رکھا۔ یوں کچھ اوراق پلٹے، کچھ الٹے اور اکتائے ہوئے ہاتھوں نے کتنی ہی کتابیں الماری کے پاس دھری میز پر بکھیر دیں۔

—— ارملا کتابوں سے باہر ہے ...

- اس کی ماں کی لاش بھی کتابوں سے باہر ہے ...

وہ ہاتھوں کی طرح، اکتا کر، میز کے پاس سے دور ہٹنے لگا تو خیال آیا — دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ ہیں، جو یوں مرتے ہیں — اور بھری دنیا میں تنہا ہی اپنے جنازے کے ساتھ جاتے ہیں....

ہاتھ عجلت میں فہرست مضامین کی طرف بڑھے، اور اس میں سے وہ خودکشی کی تاریخ کا صفحہ دیکھنے کے بعد، سنہرے حرفوں والی ایک سرخ جلد میں سے وہ صفحہ نکالنے کے بعد — خودکشی کی تاریخ پڑھنے لگا۔

خودکشی کے شعبے میں ایک صدی کی تحقیق۔

اقبال کے نچلے ہونٹ کے پاس مسکراہٹ کی ایک لکیر سی کھنچ گئی۔

"مردم شماری کی طرح مرنے والوں کی پورے اعداد و شمار کے ساتھ کی گئی تحقیق۔

یہ اعداد و شمار حرفوں میں ڈوبنے اور تیرنے لگے۔

کئی ملکوں کے تقابلی مطالعے میں آئرلینڈ کے اعداد و شمار سب سے کم ہیں۔ ایک لاکھ میں صرف تین آدمی۔

ڈنمارک، آسٹریا اور ہنگری میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے — ایک لاکھ پر بیس سے زیادہ۔

فرانس، جرمنی اور سویڈن میں — پندرہ اور بیس کے درمیان۔

انگلستان اور امریکا میں دس یا بارہ۔

ہسپانیہ، اطالیہ، ناروے میں پانچ سے لے کر دس تک
سب سے زیادہ تعداد جاپان میں....

اور ساتھ ہی اقبال کا دھیان ان حرفوں پر جا پڑا۔ "یہ تعداد بہت ادھوری سمجھی جانی چاہئے کیونکہ بہت سارے مرنے والوں کے رشتہ دار اس حقیقت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔...

ارملا نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا — لیکن پھر بھی ندی میں بہتی ہوئی ماں کی لاش کسی تعداد میں شامل نہیں۔

ہاتھ میں تھامی کتاب کا ورق کانپا.... شاید اقبال کا ایک گہرا سانس اسے چھوتے گزر گیا۔

شاید — دنیا کے سبھی مرنے والوں کی روحوں کو چھو کر

ایک ندی کا پانی اُچھلتا ہوا کناروں کو چھو گیا — پتہ نہیں دل کی ندی کا — یا اُس ندی کا جس کے اندر ارملا کی ماں کی لاش تھی۔

— اقبال کی آنکھوں کے آگے کچھ حرف پھیل گئے

خودکشی — کے لئے ہتھیاروں کا استعمال عورتیں نہیں صرف مرد کرتے ہیں۔

اور اقبال کا دل مردوں کے اُن ہتھیاروں کے بارے میں سوچنے لگا جو لوہے کے نہیں ہوتے۔

— جن وحشی ہاتھوں کے ساتھ — گاؤں کے اُس راجہ کہلوانے

والے آدمی نے ارملا کی ماں کو موت کی راہ پر گامزن کیا تھا، وہ بھی تو ہتھیار تھا ..... لوہے کا نہیں ..... صرف وحشت کا ..... زہریلے گوشت کا .... اور اقبال کی پیشانی میں سے ایک سوچ — لہو کی بوندوں کی طرح بہنے لگی — جن ہتھیاروں سے میرا اور ارملا کا مستقبل مر گیا وہ بھی تو لوہے کے نہیں تھے.....

اقبال نے اپنی آنکھوں سے اپنی طرف دیکھا — وہ ہتھیار... میرے پاؤں تھے، جو ایک سمت کو جاتے کسی اور سمت جا نکلے۔

میری آنکھیں جو جھکی کی جھکی رہ گئیں ..... میری زبان، جو چپ ہوئی چپ رہ گئی....

سب اعداد و شمار — کتاب کے اوراق میں ٹوٹنے لگ گئے

خیال آیا — لوگوں کے وہ مستقبل — جو خودکشی کر لیتے ہیں، کسی شمار میں نہیں۔

اقبال تھک کر کتاب کو ایک طرف رکھنے لگا تھا کہ خیال آیا — ایک صفحے پر دنیا میں زندہ رہنے والوں نے، مرنے والوں کے موسم کا بھی جائزہ لیا ہے....

پڑھنے لگا " باہر کا موسم جب ختم ہونے والا ہوتا ہے تو اور موسم گرما کے آغاز کے دن جب دہلیز پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس وقت خودکشی کرنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

اقبال نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کتاب ایک طرف رکھ دی، دل میں سوچوں کا اژدہام سا ہونے لگا تھا، " ایک خاص موسم خانوادوں اور

گھرانوں کی عزت کا بھی ہوتا ہے۔ جب دل کے پیڑ کے سارے نرم و نازک پتے جھڑ جاتے ہیں۔

اور اقبال من کے خشک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر اپنی اس شاخ کی طرف دیکھتا رہا جس کے ساتھ ایک رسی باندھ کر ——— آج سے تین سال پہلے اس کے مستقبل نے خودکشی کی تھی۔

(۸)

اچانک اسے محسوس ہوا ——— جیسے دروازے کو کوئی عجیب طرح سے تھپتھپا رہا ہے۔

یہ انسانی ہاتھ کی دستک نہیں تھی۔

شاید ماضی کا کوئی شور تھا جو سالوں سے اس کے کانوں میں مقیم تھا۔

اور آج اچانک کانوں میں ہلنے لگ گیا تھا۔

اس نے ایک شعوری کوشش کی، ماضی کی طرف کان لگانے کی۔

لیکن دو سالوں تک ایک سناٹا تھا ....

وہ اپنے آبائی کوہستانی گاؤں کو ذہن میں لایا، لیکن کھائیوں میں سے اٹھتی دھند گاؤں کے گھروں پر یوں لپٹی ہوئی دکھائی دی ——— کہ سارے گھر ایک بھول کی طرح نظر آنے لگے۔

اور ہوا یوں ایستادہ تھی کہ درختوں کے پتوں کو بھی جیسے ہلنا منع ہو۔

پر آواز کی بازگشت ابھی تک سنائی دے رہی تھی ۔ جیسے ناخنوں اور پنجوں

کی خراشوں سے کوئی دروازے کو اور دیوار کو اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس نے دیواروں کی طرف دیکھا، پھر دروازے کی طرف۔ اُس کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ حیران سا کھلے دروازے میں سے گزرتا باہر کے بڑے کمرے کی طرف گیا۔

اُس کمرے کی دہلیز ابھی پھلانگ ہی پایا تھا کہ کھٹ کھٹ کی آواز بلند ہو گئی ــــ پہلے سامنے کی دیوار کی طرف، پھر بائیں سمت کے بند دروازے کی طرف اس نے دروازے کی زنجیر گرا دی اور عجلت سے سرک کر روئی کے گالے جیسے کوئی چیز اندر کو آئی اور اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔

"ارے تم؟"

اس نے جھک کر سفید روئی کے گالے جیسے "پام رینین" کتے کو ہاتھوں میں اٹھا لیا، پچکارا اور پوچھا ــ تو اکیلا کس طرح آ گیا؟ اتنی دور؟ خود ہی راستہ تلاش کر لیا۔؟

وہ چھوٹی سی زبان سے اُس کے ہاتھوں کو چاٹنے لگا۔

یہ چھوٹا سا کتا، اُس کے وطن سے جانے کی خبر سن کر اُس کے دفتر کے ایک رفیق کار نے اُس سے مانگ لیا تھا، اور پرسوں اُس نے اُسے دے دیا تھا لیکن آج ....

اُسے ہنسی سی آ گئی ــ لوگ تو کہتے ہیں یہ "پام رینین" نسل کے کتے بڑے ڈرپوک ہوتے ہیں، جتنے خوب صورت ہوں، اُسی قدر

تانے، بارش کی بوچھاڑوں سے ایک دوسرے کو بچاتے ـــــ بالکل اس کی کار کے پاس آ گئے تھے ...

اس نے زور سے بریک لگایا، اتنی زور سے کہ پہیوں کے چیخ کر رکنے کی آواز گونجی ـــ اور پوری شدت سے ہوا میں پھیل گئی اور الٹنے کی انتہا پر آ کر، جھٹکے سے رک گئی۔

سڑک کے دو طرفہ دکانوں سے کچھ لوگ دوڑ کر آ گئے ـــ

ـــــ کیا ہوا صاحب ؟

اس نے گاڑی کو دونوں طرف سے گھیرے ہوئے لوگوں کو حیرانی سے دیکھا اور کہا "کچھ نہیں، وہ لوگ گاڑی کے نیچے آ چلے تھے۔"

لوگوں نے سامنے خالی سڑک کی طرف دیکھا، ان کی متحیر آنکھیں جیسے پوچھ رہی ہوں، کون ؟

وہ گاڑی سے اترا اور سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگا لیکن سڑک دور تک خالی تھی۔

اس نے گھبرا کر، نیچے گاڑی کے پہیوں پر نگاہ ڈالی ـــ جیسے سڑک پر جاتے ہوئے دو لوگ، اگر سڑک پر نظر نہیں آئے تو یقیناً گاڑی کے پہیوں تلے کچلے گئے ہوں گے۔

لیکن کہیں بھی کچھ نہیں تھا۔

لوگ متحیر تھے ـــــ "صاحب! گاڑی الٹ چلی تھی، مشکل سے بچی ہے۔"

ڈالتا ہے، اسی طرح اپنے آپ کو بھی....

اس نے اپنے لئے گلاس میں کچھ وہسکی اور پانی انڈیلا، پھر گلاس کو اوپر اٹھا کر کہنے لگا "دنیا کے سارے بندھنوں اور زنجیروں کے نام جن کو انسان کی کسی نہ کسی دانش مندی نے بنایا ہے....

کچھ دیر بعد اسے خیال آیا — پتہ نہیں مسٹر اچاریہ نے اسے زنجیر کیوں نہیں ڈالی؟

یہ بہت چھوٹی ہے، زنجیریں تو عمر کے ساتھ پڑتی ہیں۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو جواب دیا۔

اور پھر اسے خیال آیا ——— وہ لوگ اسے تلاش کر رہے ہوں گے، ہو سکتا ہے کہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آجائیں۔

آج وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی آئے۔ سوچا — خود جا کے چھوڑ آؤں۔ باہر سے ہی کسی نوکر کے سپرد کر کے لوٹ آؤں.....

اس نے بڑی تیزی سے کپڑے پہنے، ابھی تک اس کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا۔ اوپر صرف ڈریسنگ گاؤن لپٹا ہوا تھا۔ اس نے چھوٹے سے "پام ریسین" کو ہاتھ میں تھاما اور باہر آکر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔

اُسے گاڑی میں ڈالا اور گھر کے بیرونی پھاٹک کو کھول رہا تھا کہ اچانک اس وقت ایک دست سوال اُس کی جانب بڑھا۔

دروازے پر سے گزرتا ایک سادھو فقیر ہاتھ کا کشکول اس کی

جانب بڑھائے، دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔
وہ سادھو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

—— کیا چاہتے ہو بابا

—— جو توفیق ہو۔

—— توفیق کو بھیک کی طرح مانگو گے بابا۔

—— نہ مانگنے کا کوئی تکبر نہیں بیٹا

—— لیکن اگر اس دنیا سے کچھ مانگتے رہنا تھا بابا تو دنیا ترک کیوں کی؟

—— وہ تو جسم کے قائم رہنے تک ترک نہیں کی جا سکتی۔

—— پھر اگر ترک نہیں، تو ترک کا ملبوس کیوں؟

—— ترک ہے بیٹا

—— کس چیز کا؟

—— من کا

—— اور تن کا؟

—— وہ مجبوری ہے... تھوڑے سے نان نفقے کی ضرورت جسم کی مجبوری ہے۔

—— پھر بابا، اگر جسم کو انکار نہیں، تو من کو انکار کیوں؟

—— جسم کے بھی تقاضے ہیں بیٹا، صرف اُس کی آگ بجھانے کے لئے دو مٹھی اناج۔

—— کیا من کی آگ سچ نہیں ہے بابا؟

--- وہ بھی سچ ہے سخی داتا۔ لیکن اس کی خوراک اور ہے

— وہ کیا ؟

— اللہ --- اس کا بنانے والا

— کیا جس ماں نے جنم دیا، یہ تمہارے جسم کو تخلیق کیا، وہ اللہ نہیں تھی ؟ چھوٹا سا اللہ

— وہ مایا کا جال ہے بیٹا

— کیونکہ دکھائی دیتا ہے . . لیکن خدا دکھائی نہیں دیتا، اس لئے اس کا جال بھی دکھائی نہیں دیتا . . . کیا جو دکھائی دیتا ہے صرف وہی جھوٹ ہے ؟

اس کے باطن میں سادھو کے لئے کھولتا ہوا غیظ جیسے اُس کی آنکھوں میں امڈ آیا ہو۔

سخی داتا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

— صرف جاننا چاہتا ہوں بابا کہ اگر من کو دنیا کا اَن نہیں چاہیئے تو تن کو دنیا کے اَن کی ضرورت کیوں ہے ؟

— ہاں سخی داتا ! تن کی بھوک باطنی منظر جیسی نہیں۔

— سو جب تک جسم ہے، باطنی منظر کی تفہیم ممکن نہیں

— یہ جسم کی مجبوری ہے سخی

— اگر جسم کی مجبوری قبول کرلی بابا تو من کی مجبوری کو کیوں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس بچی کا کیا قصور تھا بابا جو آپ کے من کی مجبوری نہیں

بنی ؛ کیا وہ اللہ ہی کی ایک تجلی نہیں تھی ۔

—— کون سی بچی ؟

جس کی ماں کی لاش اب بھی دنیا کے پانیوں میں بہتی چلی جارہی ہے ....

کون ماں ؟ کس کی لاش

اس نے پھاٹک کے سر دھہرلوہے کے ساتھ اپنا تپتا ہوا سر رگڑا اور پھر سامنے کھڑے سادھو کے چہرے کی طرف دیکھتا —— خیالوں ہی خیالوں میں دور فضا میں کچھ تلاش کرنے لگا ۔

کوئی چہرہ فضا میں بنتا دکھائی دیا اور وہ سادھو دروازے کے آگے سے نکل کر جا چکا تھا ۔ اب وہاں صرف وہ باقی رہ گیا تھا یا پھر راکھ کی طرح بکھری ہوئی سوچ کی لکیریں " ارملا کا باپ ، جو اس کو چھوڑ کر سنیاسی ہوگیا ۔ کیا میں اس کو ڈھونڈ رہا ہوں ۔ میں نے یہ کس طرح سوچا کہ یہ وہی تھا ۔

اس نے پھاٹک کو کھول کر گاڑی باہر سڑک پر نکالی اور سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے سوچا " میرا قہر میری اپنی جان پر ہے " یہ میرے اپنے من کا ثمر تھا جسے میں اپنے شانوں سے اتار کر کسی دوسرے کے سر منڈھ دینا چاہتا تھا ۔

شہر کی سڑکیں گاڑی کے پہیوں کے نیچے سے گزرتی رہیں اور اس

کی سوچیں من کے پاؤں تلے سے ——

ارملا کے باپ کی ایک مجبوری تھی — اپنی محبوب شریک حیات کی لاش کا منہ دیکھنے کی مجبوری - اس کے ٹوٹے ہوئے من میں اگر اپنی بیٹی کا پیار بھی ٹوٹ گیا ہو — تو اس کا قصور نہیں تھا — لیکن

یہ لیکن، اس کے پاؤں کے نیچے ایک کھائی کی طرح ظاہر ہوا، سوچوں کے پاؤں لرزے — کیا رشتہ صرف باپ ہی کا ہوتا ہے؟ پیار کرنے والے کا نہیں؟ اس نے لالچ کا رشتہ توڑ دیا، ممتا کا توڑ دیا اور میں نے محبت کا....

لیکن کتنے بے ہنگم اسباب ہیں، یہ سب کچھ ہوا؟ اس نے جو کچھ چھوڑا تھا دنیا کو چھوڑنے کی غرض سے اور میں نے جو کچھ چھوڑا —— دنیا کو پانے کے لئے۔

گاڑی چلاتے ہوئے وہ اپنے آپ میں نہیں تھا، سڑکوں کے نام اور راستے جانے بغیر وہ ڈرائیو کر رہا تھا لیکن عادت نے اس کا ساتھ دیا گاڑی اچانک رکی — تو سامنے اچاریہ کا گھر نظر آ رہا تھا۔

یہ شاید گاڑی کے ہارن کی آواز تھی، سامنے والے گھر سے ایک ملازم دوڑتا ہوا گاڑی کے پاس آیا۔

—"صاحب! ہمارا مام رینین نہیں مل رہا"

—"یہ لو، اب سنبھال کے رکھنا!"

اس نے نشست کے اوپر سے مختصر سے کتے کو اٹھایا۔ ایک بار اُس کے بالوں کو دلارا اور پھر نوکر کے حوالے کر دیا۔

—— صاحب بہت پریشان ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اسے بہت تلاش کرتے رہے۔ آپ کو بھی فون کرتے رہے لیکن آپ کا فون خراب تھا۔۔

—— فون خراب تھا ؟

—— ہاں صاحب، بالکل ڈیڈ ۔ ۔ ۔

اسے یاد آیا —— آج جس وقت مسٹر پوری کا فون آیا تھا۔ اس نے اُس کے بعد فون کا پلگ اتار کر رکھ دیا تھا۔

نوکر کہہ رہا تھا —— ابھی صاحب آپ کے یہاں جانے والے تھے

وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے جانے لگا تو نوکر نے عجلت میں کہا ۔ ۔ ۔

"صاحب اندر نہیں آئیں گے"

"نہیں بہت جلدی ہے ۔"

اُس نے تیزی سے گاڑی موڑ لی

اسے خود پر ہنسی بھی آئی —— بہت جلدی ہے ۔ اس جگہ پہنچنے کی، جس کا کوئی وجود نہیں ۔

⑨

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے، لیکن اچانک گہرے ہو گئے اور باریک باریک بوندیں پڑنے لگیں۔

اس نے گاڑی کا وائپر آن نہیں کیا، صرف رفتار دھیمی کر دی۔ اور سامنے ونڈ اسکرین میں سے آس پاس کی عمارتوں کو یوں دیکھنے لگا — جیسے سارے شہر کو دھندلا کر کے دیکھنا چاہتا ہو....

اس کے ہاتھ پر ایک گیلا سا لمس ابھی تک تھا۔ کچھ روئیں کے گچھے "پام رینین" اس کے ہاتھوں سے رخصت ہوتے وقت چھوڑ گیا تھا اور پھر اس کے ہاتھ کو زبان سے چاٹتا رہا تھا، اس کی گیلی زبان کی نمی ابھی تک اس کے ہاتھوں پر تھی۔

زندگی کے کئی بیتے ہوئے دن بھی شاید گیلی زبان کی طرح ہوتے ہیں —— اسے لگا — اور خیال آیا — کتے کو پالنے کا انسانی مشغلہ بہت پرانا ہے، تاریخ کہتی ہے کہ آج سے چودہ ہزار سال پہلے بھی...

اور ذہن، انسانی تہذیب کے کھنڈروں کو ٹٹولنے لگا، لیکن کتنی ہی یادوں کو پالتو بنا کر رکھنے والا مشغلہ معلوم کتنا پرانا رہا ہوگا۔

اس کے ذہن میں ایک عجیب نظریے نے جنم لیا — جس طرح کتوں کی کئی نسلیں ہوتی ہیں اسی طرح انسانی یادوں کی بھی کئی نسلیں ہوتی ہیں۔ کچھ یادیں صرف نرم بالوں جیسی ہوتی ہیں: پیروں اور ہاتھوں

سے لپٹ جانے والی، چھوٹی سی زبان سے جسم کی کھال کو چاٹتی.... اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے ساتھ ٹمٹما کر آپ کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی، کچھ، جن کی آنکھیں بھی سامنے نہیں ہوتیں، بالوں میں گہری چھپی ہوئی، لیکن یہ پتہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں چھپ کے آپ کو دیکھ رہی ہیں۔

کچھ، آپ کا پہرہ دینے پر مامور ہوتی ہیں اور دنیا کے ہر کھٹکے پر بھونکتی ہیں۔

اور کچھ یادیں، یادوں کی دشمن، ایک دوسرے کے وجود کی منکر، آپس میں الجھتی، ٹکراتی اور ایک دوسرے کو لہولہان کرتی۔

—— اور کچھ یادیں، آپ خواہ کہیں بھی چلے جائیں، وہ آپ کے نقوشِ پا کو سونگھتی، آپ کا تعاقب کرتی ہیں اور آپ کو ہمیشہ تلاش کر لیتی ہیں۔

اور کچھ یادیں، صرف روٹی کے ٹکڑے کے لئے دم ہلاتی ہیں.... اور کچھ بولائی ہوئی اور ان کے منہ سے جھاگ بہتے ہوئے، اور اس کے پاؤں کو جیسے کسی باؤلے کتے کے دانتوں سے بیس کر رکھ دیا....

اور پاؤں گھبرا کر اس سے پیچھا چھڑانے لگا —— مگر گاڑی کے ایکسیلیٹر پر دب گیا۔

بائیں سمت کی طرف مڑتی ہوئی کار والے نے اگر زور سے بریک نہ لگایا ہوتا تو دل کا حادثہ، باہر سڑک پر بکھر جاتا۔

اس نے ماتھے پر آئے پسینے کے قطروں کو گھبراہٹ میں پونچھا اور گاڑی کو سڑک پر دھیمی رفتار سے چلاتے، وائیر کو آن کر دیا۔

چلتے ہوئے وائیر کے ساتھ اسے شہر کی عمارتیں ایسی نظر آئیں ——

جیسے ایک پل اُن پر کوئی ملتانی مٹی ملتا ہو اور دوسرے پل پونچھ دیتا ہو۔
دن کی روشنی ابھی باقی تھی لیکن بارش نے اسے ڈھانپ لیا تھا اس لئے کئی عمارتوں میں ... برقی قمقمے روشن ہو گئے تھے۔

چھوٹے چھوٹے گول گول ٹکڑوں میں بٹی روشنی میں .... اور آگ کو پالتو کر کے رکھنے والی بات پر اسے ہنسی آ گئی۔

پالتو آگ میں سے دھواں نہیں اٹھتا۔ اسے خیال آیا — لیکن اور سب طرح کی آگ میں سے دھواں اٹھتا ہے۔

دھوئیں نے اس کا دھیان سگریٹ کی طرف موڑ دیا اور اس نے جیب میں سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگائی۔

سگریٹ کے دھوئیں میں سے کئی طرح کے دھوئیں اٹھنے لگے۔

پروں میں سے اٹھتا دھند کا دھواں۔

پہاڑ کانوں کے چولہوں سے اٹھتا لکڑیوں کا دھواں۔

ہوں کی آگ سے اٹھتا سا سگری کا دھواں۔

کارخانوں کی چمنیوں میں سے اٹھتا دھواں۔

اور مڑھیوں کی آگ میں سے .....

پوری کی پوری زندگی — اس کی آنکھوں کے آگے انگارے کی طرح جلی اور راکھ ہو گئی۔

پھر اس کا اپنا سانس ہی جیسے اس کے ہونٹوں سے ٹکرایا — کہر آلود فضا میں منہ سے نکلے ہوئے دھوئیں کی طرح۔

اور پھر سانس جیسے اچانک معطل ہو گیا ہو۔ سامنے سڑک پر کوئی دو آدمی، ایک جوان لڑکی اور ایک اس کا ساتھی، سروں پر ایک ہی چھاتا

بزدل، پھر یہ اکیلا راستہ تلاش کرتا، اس کے پاس کس طرح لوٹ آیا؟
اس نے اس کی ریشمیں روئیں کو دلارا، پھر باورچی خانے میں جاکر اسے ایک بسکٹ دیتے ہوتے، اُس کے لئے پیالے میں دودھ انڈیلا۔
—— تو سونگھ کر پہچان لیتا ہے نا؟ مجھ میں کیا پایا تھا جسے سونگھنے کے لئے پھر لوٹ آئے؟
تو وہ روٹی کا گالا جیسا، دودھ کو بڑتنا، پھر اس کے پاؤں کے قریب آکر پاؤں چاٹنے لگا....
اس کی انگلیاں، اس کے بالوں میں چھپی ہوئی سی، کانپ کر رہ گئیں — کسی کے جسم کی پہلی خوشبو.... پہلی پہچان.....کیا عمر کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے؟
یونہی، اس کی انگلیاں، ارملا کے لمبے لمبے بالوں میں ڈوب جایا کرتی تھیں....
اسے لمبے اور اڑتے ہوئے سے بالوں میں سے مہک سی چڑھ جایا کرتی تھی۔ آج اُسے ایک عجیب خیال آیا —— اگر ساری دنیا کی عورتوں کو کسی ایک جگہ جمع کر کے بٹھا دیا جائے، اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے کوئی کہے "بھلا بتلا، اُرملا کون ہے؟ کہاں ہے؟ ——" تو وہ بالوں کو سونگھ کر اسے فوراً پہچان لے گا۔
"لیکن انسان کے پاس دانش مندی تو ہوتی ہے نا" ایک تبسم اُس کے ہونٹوں پر لکیر کی طرح ابھرا —— وہ جیسے جانوروں کو زنجیریں

—— لیکن وہ ؟

—— وہ کون ؟

—— کوئی دو لوگ تھے، چھاتا لے کر چلے جا رہے تھے

—— لیکن سڑک پر تو کوئی نہیں۔

وہ پریشان سا ہو کر پھر گاڑی میں بیٹھ گیا، گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور سامنے بچھی ہوئی خالی سڑک کو دیکھتا ڈرائیو کرنے لگا۔

اس کے ہاتھوں میں موہوم سی کپکپاہٹ نے انگڑائی لی ....

خیال آیا —— جب وائپر آن نہیں تھا سارے شہر کو دھندلا کر کے دیکھ رہا تھا .... ہر چیز کو دھندلا کر کے .... لیکن وہ چھاتا دھند میں سے کیسے نکل آیا ؟

اسے بہت پرانا، ایک دن یاد آگیا — جب ارملا برستے بادلوں کے بیچ کالج سے گھر کی جانب چل دی تھی۔

اور وہ کتنی دیر تک چلتی ہوئی ارملا کی بھیگتی کمر پر نظر گاڑے دیکھتا رہا تھا اور پھر وہ قریب ہی ایک پان والے کی دکان کی جانب دوڑ پڑا تھا، اور ایک روپے کا نوٹ پان والے کو دے کر، اس کا چھاتا ادھار لیا اور ارملا کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

ہاتھ میں تھاما ہوا چھاتا، اس نے دوڑ کر ارملا کے سر پر تان دیا تھا ارملا نے بھی چھاتے کے ہینڈل کو سنبھالا دیا تھا۔

اور پھر وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہینڈل پر گرفت

مضبوط کر کے، چھاتے کو اپنے سر سے اُدھر —— اس کے سر کی طرف بڑھا دیتی تھی
چھاتا ایک ہی تھا، اور کبھی اس کا آدھا بدن بھیگ جاتا تھا، کبھی وہ...

اس کا پاؤں کبھی ایکسیلیٹر پر کانپتا رہا، کبھی بریک پر اور اس کی گاڑی شہر کی کئی سڑکوں پر موڑ کاٹتی رہی...

لیکن سوچ کی گاڑی صرف ایک ہی سڑک پر دوڑتی رہی —— آج وہ گاؤں کے چھاتے کے ہینڈل والا دن، شہر کی سڑک پر کیسے نکل آیا؟

وہی مینہ کے جھالے؟ وہی چھاتا؟

وہ گھر سے صرف اپنے "پام رینین" کو شری اچاریہ کے گھر چھوڑنے آیا تھا۔ لیکن گھر واپس لوٹنے کے بجائے، وہ شہر کی سڑکوں پر، جو موڑ سامنے آتا، اُسی پر گاڑی موڑتا، شہر کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

بارش ابھی تک نہیں رکی تھی، اس لئے سڑکیں اور بھی سنسان ہونے لگی تھیں اور کئی جگہوں پر، خاص کر سڑکوں کے کناروں کی طرف بڑھی ہوئی دوکانیں، بند ہونے لگی تھیں۔

پھر اکیلے، بھیگتے، اور جلتے بجھتے شہر کو دیکھنے کا ایک تجربہ، اچانک اس کے من میں کسی ایسے ملک، ایسے شہر سے مل گیا تھا، جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صرف ایک قیدی کی ڈائری میں پڑھا تھا۔

مجھے کانچ کی ایک بند گاڑی میں بٹھا کر وہ لے جا رہے ہیں....
گاڑی بھرے شہر میں سے گزر رہی ہے۔ اور آس پاس لوگ گرتی ہوئی برف

کے درمیان بھی چل پھر رہے ہیں۔ بجلی کی روشنی میں برف عجیب انداز میں چمکتی ہے۔ لوگوں کے چہرے بھی عجیب طرح روشن ہیں۔ ایک سرد اور ایک گرم رَو مل کے اُن کے چہروں پر نقش ہے۔ برف کی برودت، اور زندگی کی حدت .... میں کانچ کے جوف میں سے ان کو دیکھ سکتا ہوں لیکن ان تک یہ خبر نہیں پہنچا سکتا کہ میں آج بھرے شہر میں سے گزرتے ہوئے بھی بالکل تنہا ہوں... اور اب چند لمحوں بعد میں ان کی آبادی کا حصہ نہیں رہوں گا۔

اور وہ، گاڑی کو چلاتا، گاڑی کے شیشوں میں سے بھرے شہر کو ایک .... ایسی حسرت سے دیکھنے لگ گیا، جو بہت برسوں کے لئے کسی جیل میں جانے سے پہلے صرف ایک قیدی ہی دیکھ سکتا ہے۔

پھر سامنے جب ایک چوک کے لال سگنل نے اس کا پاؤں بریک پر رکھوا دیا، تو اس کے حواس نے اسے تھام کر یہ سندیسہ دیا "زندگی میں بند شیشوں والی کچھ وہ گاڑیاں بھی ہوتی ہیں، جنھیں انسان خود ہی چلاتا ہے اور خود ہی ان میں قیدی ہو کر بیٹھتا ہے ....

چوک کے سرخ سگنل نے جب رنگ بدلا اور ہرا دائرہ بنایا تو اس نے چوک عبور کر کے گاڑی کو اگلے موڑ سے گھر کی راہ پر ڈال دیا۔

یہ بھی جیسے خود کو دیا ہوا خود اپنا حکم تھا۔

یوں محسوس ہوا ـــــ شاید یہ گھر کو جانے والی سڑک ہی تھی، جس سے بچتا، وہ کئی گھنٹوں سے شہر کی سڑکیں ناپتا پھر رہا تھا۔

بارش تھم رہی تھی، بس کوئی کوئی بوند باقی تھی۔ اس نے وائپر بند کر دیا،

لیکن کچھ دیر بعد دیکھا ـــــ شیشے پر گرتی کسی کسی بوند کے ساتھ، وہ کچھ یوں نظر آ رہا تھا جیسے شیشے کو پسینہ آ گیا ہو...

گاڑی جب گھر کے پھاٹک میں سے گزر کر، دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تو اس نے گاڑی میں سے اترتے، بیرونی دیوار پر آویزاں پیتل کی اس پلیٹ کو دیکھا جس پر اُس کا نام لکھا تھا ـــ جیسے ہر جیل کے باہر جیل کا نام لکھا ہوتا ہے۔

(۱۰)

نہ معلوم اس کا ہاتھ کیوں کر دروازے کے پہلو میں لگی گھنٹی کے بٹن کی طرف رینگ گیا ـــــ جیسے وہ ایک ملاقاتی ہو، اور اس گھر میں کسی سے ملنے آیا ہو۔

گھنٹی پوری شدت سے بج اٹھی اور اس کا ہاتھ بے حس ہو کر رہ گیا، ہوا تیز ہو گئی تھی، اچانک دیوار کے ساتھ لگے پیتل کے ٹکڑے میں سے، جیسے ایک ذرہ برابر ٹکڑا ہوا کے جھونکوں سے چھڑ گیا ہو، اور زمین پر اس کے گرنے کی آواز آئی ہو۔

اس نے چونک کر اُدھر دیوار کی طرف دیکھا۔

اس کے نام والے پیتل کے اس ٹکڑے کے سلنے میں شاید ایک کیل

نیچے گر پڑی تھی لیکن سینے میں گڑی ہوئی دوسری کیلوں کے سہارے وہ اب بھی دیوار سے منسلک تھا۔ لیکن لٹکتا ہوا سا... اور ہوا کے ساتھ جھولتا، جیسے ہاتھ ہلا کر اس سے کچھ کہہ رہا ہو۔

سارا گھر دیواروں میں بھی سمٹا ہوا تھا اور اندھیرے میں بھی لپٹا ہوا تھا لیکن بیرونی سڑک کی بتی کی روشنی چھن چھن کر کہیں اپنا عکس چھڑک رہی تھی جس میں وہ پیتل کا ٹکڑا ایک آنکھ کی طرح چمک کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کا اپنا نام، جیسے اس کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا، چابی ٹٹولی اور دروازے کے اندھیرے میں چھپے ہوئے تالے کے سوراخ کو تلاش کرنے لگا۔

جیل کے داروغہ کی طرح جب اس نے بھاری بھرکم دروازے کو کھول لیا تو ایک قیدی کی طرح اس کے باطن میں اتر گیا۔

مینہ کی بوچھاڑیں، جب سر کے بالوں میں اٹک کر، کمرے کے اندر آجاتی ہیں، اسی طرح پچھلے دنوں پڑھی کسی قیدی کی ڈائری کے بعض الفاظ ——— جیل، داروغہ، قیدی اس کے ذہن میں اٹک کر خواہ مخواہ اس کے ساتھ چل پڑے ہیں۔

خواب گاہ کی روشنی جلا کر اس نے الماری میں سے وہسکی کی بوتل بڑی تیزی سے نکالی، اور کٹے ورک کے ایک خوب صورت چیک گلاس میں ڈالتے ہوئے ——— ان لفظوں کی گرد جھاڑنا چاہی جو کسی کتاب میں

سے نکل کر بھگڑے کے کانٹوں کی طرح اس کے پاؤں سے لپٹ گئے تھے۔

کانچ کی صراحی میں سے گلاس میں پانی انڈیلنے کے بعد، جب اس نے گلاس ہونٹوں سے چھوا تو کانوں میں کہیں سے ایک آواز آئی ——

اے بندے! میرے سوالوں کا جواب دیئے بغیر اس گلاس کو منہ نہ لگانا...

اس کو ایک بہت پرانی داستان یاد آئی —— ایک تاریخی بازگشت ... جب وہ پانچوں پانڈوؤں میں سے ایک پانڈو ہوا کرتا تھا، اور وہ سب دروپدی کو ساتھ لے کر جنگلوں میں پھرا کرتے تھے .... بہت پیاس لگی تھی تو یدھشٹر نے کہا تھا، جاؤ نکل، پانی کا چشمہ تلاش کر۔

اُس نے پانی کا چشمہ تلاش کیا تھا، لیکن جب پانی لینے کے لئے جھکا تو کنارے کے درخت سے آواز آئی تھی "ہے، نکل! میرے سوالوں کا جواب دیئے بغیر یہ پانی مت پینا، نہیں تو موت تمہیں تم سے چھین لے گی۔

لیکن اُس نے آواز کی طرف دھیان نہیں دیا تھا اور پانی کے جھرنے کے نیچے کھڑے ہو کر پانی پر اپنے لب رکھ دیئے تھے ... اور پانی پیتے ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا۔

لگا تھا —— یہی آواز تھی، جو اس وقت ایک درخت سے آئی تھی۔

اس نے متحیر ہو کر اوپر دیکھا۔

اوپر صرف کمرے کی چھت تھی اور کچھ نہیں —— نہ کوئی درخت ...

نہ پرچھائیں .... اس نے جنماں جنما تراں کی اُس آواز کو پہچاننے کی کوشش کی، شاید یہی سوالات تھے جو کئی جنم پہلے بھی اس آواز نے پوچھے تھے۔

پہلا سوال تھا ——— سورج کو کون طلوع کرتا ہے؟
دوسرا سوال تھا ——— سورج کو کون غروب کرتا ہے؟
اور تیسرا ——— سورج کس کے چاروں اور گھومتا ہے؟
اور چوتھا ——— سورج کا خیر مقدم کون کرتا ہے؟

سوالات جانے پہچانے لگے لیکن جواب؟ جواب تو اس وقت بھی اس نے نہیں دیئے تھے، یدھشٹر نے دیئے تھے۔

اُس نے آج بھی، آواز کو سماعت سے جھٹک کر، ہاتھ میں تھامے ہوئے گلاس کو پی جانا چاہا لیکن ہاتھ رک گیا، آواز ذہن کی دیواروں سے ٹکرائی....

اے آج کے انسان! میرے سوالوں کا جواب دیئے بغیر اس گلاس کو منہ نہ لگانا، نہیں تو....

نہیں تو، کے آگے جو کچھ ہو سکتا ہے، وہ اس کے ساتھ ہو چکا تھا، جب وہ نکل ہوا کرتا تھا۔

آواز نے، صدیوں سے ہوا میں معلق سوالات دوہرائے، وہی چاروں سوالات اور پھر اگلے سوالات۔

——— گیا تا کون ہے؟

——— عظیم منصب کیسے حاصل ہوتا ہے ؟
——— انسان ایک سے دو کیسے ہوتا ہے ؟
——— عقل کیسے حاصل ہوتی ہے ؟

ارملا، اُس کے ذہن میں سورج کی طرح بلند ہوئی، اور پھر اچانک ——— اس کے آسمانوں کو ایک بار شفق گوں کر کے، سورج کی طرح غروب ہو گئی .....

دل میں گھور اندھیرا چھا گیا ....

گھور اندھیرے میں اُس نے گھبرا کر ہاتھ میں تھاما ہوا گلاس منہ کو لگا لیا۔

سوال اسی طرح تشنۂ جواب، ہوا میں معلق رہ گئے۔

اور وہ، جیسے آواز نے کہا تھا، پلنگ پر حواس باختہ سا ہو گیا۔

شاید ——— پھر موت کی بد دعا لگ گئی ہو، جیسے اس وقت لگی تھی، جب وہ نکل تھا۔

(۱۱)

نہیں وہ مرا نہیں، شاید زندہ ہے، اسے لگا ——— کوئی اُس کے پلنگ کے پاس کھڑے ہو کر اس کے بازو کو ہلا رہا ہے، اور اُس کا بازو

زندہ انسان کے بازو کی طرح ہل رہا ہے۔

یاد دوں کی بد دعا اُسے ضرور لگی تھی۔ خیال آیا، جب میں نکل تھا، آخر مرا تو اس وقت بھی نہیں تھا یدھشٹر نے سارے سوالوں کے جواب دے دیئے تھے اور اس نے زندگی کا حکمنامہ حاصل کرلیا تھا۔

یوں لگا.... آج پھر یدھشٹر نے اس کے لئے سوالوں کے جواب دے دیئے ہوں گے اور وہ اسے بازو سے پکڑ کر چارپائی سے اٹھا رہا ہے...

اس نے بازو کی سمت دیکھا ــــــ لیکن وہاں کچھ دکھائی نہ دیا ویسے اس بات کا یقین ضرور آگیا کہ وہ زندہ ہے...

حلق سے چیخ جیسی آواز نکلی ــــــ سوالوں کے جواب کس نے دیئے ہیں؟ یدھشٹر نے؟

کمرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا لیکن کوئی ہولے سے ہنسا ــــــ یہ یدھشٹر کا زمانہ نہیں۔

ــــــ پھر؟

ــــــ آج کے سوالوں کے جواب تمہیں خود دینے ہوں گے۔

ــــــ وہی سوال؟

ــــــ ہاں وہی سوال، لیکن زمانہ بدل گیا ہے...

ــــــ سوال نہیں بدلے؟

ــــــ نہیں، لیکن لفظ بدلے ہیں..

—— کس طرح ؟

—— جس طرح تیرا نام بدل گیا ہے، اس وقت نکل ہوا کرتا تھا لیکن آج ....

—— میں جانتا ہوں ...

—— پھر اٹھو

—— کہاں جانا ہوگا ؟

—— عدالت میں

—— کس کی عدالت میں ؟

—— یہ تم خود جا کر دیکھنا

لگا کہ ہاتھ نے اس کو پلنگ سے اٹھایا ہے ... کمرے میں بالکل اندھیرا تھا، شاید اس اجنبی ہاتھ نے کمرے کی بتی بجھا دی تھی .... لیکن بازو کی کلائی کے پاس کسی کے ہاتھ کی گرفت بدستور ہے۔

وہ اٹھ کے چل پڑا ....

لگا ... وہ زمین کے ایک عام آدمی کی طرح چالیس لاکھ تین سو بیس سالوں سے چل رہا ہے، اور کوئی برہما آج ہنس کر اس سے کہہ رہا ہے .... ابھی تو صرف ایک دن ہی بیتا ہے۔

چالیس لاکھ تین سو بیس سال جتنا ایک دن ....

اس کی اندھی دیومالا اپنے رنگوں سے بولی —— آج فیصلے کا دن ہے، کسی منصف کے روبرو جواب دہی کا دن، جو اپنا فیصلہ کسی بھی فریق کے حق میں

صادر کرسکتا ہے۔ زندگی سے نجات کا فیصلہ بھی اور اس زندگی کو پھر جِلانے کا فیصلہ بھی۔

ایک دوسرا فیصلہ میری سزا ہوگا۔۔۔۔ اس کو اپنے باطن میں سے کسی آواز نے کہا لیکن وہ چپ چاپ چلتا رہا۔

یہ شاید گہرے اندھیرے کا اثر رہا ہو ——— وہ مرچکا ہے، اور اب اسے زمین سے یم پوری کی طرف لے جایا جارہا ہے۔!

پوچھا، "ہے دوت! تم مجھے یم پوری لے جارہے ہو؟"

جواب ملا "سب تیرے ہی ایجاد کئے ہوئے الفاظ ہیں، اگر تم اسے یم پوری کہنا چاہو تو ضرور کہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

——— راستہ کتنا ہے؟

——— تمہاری گنتی کا حساب میں نہیں جانتا۔

جواب دینے والا خاموش ہوگیا تو اسے یاد آیا ———

ایک بار یدھشٹر کے استفسار پر کرشن نے بتایا تھا کہ زمین سے یم پوری چھیاسی ہزار یوجن ہے۔۔۔۔

اور وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگا ——— چار کوس کا ایک یوجن ہوتا ہے، تو چھیاسی ہزار یوجن کو چار سے ضرب دیں تو بنتا ہے۔۔۔۔

اور ساتھ ہی ایک ہیبت ناک سوچ نے جنم لیا ——— کرشن نے یہ ساری معلومات بہم پہنچاتے ہوئے کہا تھا کہ اس راستے میں نہ کوئی پیڑ آتا ہے، نہ کنواں، نہ تالاب، نہ کوئی نگر گاؤں، نہ آشرم، سارا راستہ

اندھیروں سے پٹا ہوا ہے۔

اس نے بھوک یا پیاس کو محسوس کرنا چاہا لیکن لگا کہ نہ اس وقت اسے بھوک ہی لگی تھی اور نہ پیاس اور چھیاسی ہزار یوجن کا تصور کر کے بھی اُس کے پاؤں میں تھکن نہیں جاگی۔

لیکن ایسا لگا —— کچھ ہے، جو اندھیرے میں اس کے تعاقب میں چلا آرہا ہے۔

اُس نے کھڑے ہو کر پیچھے کی جانب دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔

پوچھا "ہے دوت! ہے راہ نما! میرے پیچھے پیچھے کون آرہا ہے، کچھ ہے جو میرے ساتھ چل رہا ہے لیکن میں دیکھ نہیں سکتا۔"

جواب ملا "لیکن اپنے آپ میں ایک سوال کی طرح —— آج کے انسان کے ساتھ کون چل سکتا ہے؟"

اس نے پھر کہا "معلوم نہیں، لیکن کسی وقت کرشن نے یدھشٹر سے کہا تھا کہ انسان جب زمین سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی نیکیاں اور گناہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتے اس کے ساتھ جاتے ہیں۔

اندھیرے میں دھیمی سی ہنسی کی آواز سنائی دی، ساتھ یہ بھی "ہو سکتا ہے تیرے ہی سنسکار تیرے پیچھے پیچھے آرہے ہوں . . . ."

اس نے بڑی سرعت سے کہا "نہیں سنسکار نہیں، لیکن ہو سکتا ہے یہ

میرے تصورات ہوں، جو میرے عقب میں میرے ساتھ آ رہے ہیں۔"
جواب ملا "ہاں ہو سکتا ہے"

پھر بہت دیر اندھیرے کی طرح، چپ بھی چھائی رہی....
صرف وہ خیالات جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، قدم ملا کر اس کے ساتھ چلنے لگے۔
ایک نے اس کے بالکل قریب آ کر، ہاتھ کی ہتھیلی کے ساتھ اسے کوئی جڑی بوٹی سنگھائی اور ایک عجیب سی خوشبو میں لپٹ کر اس نے پوچھا۔
یہ تم نے مجھے کیا سنگھایا ہے؟
ایک جڑی بوٹی!
کیوں؟
اس کے ذریعے ہزاروں سال پرانی یاد دلائی جا سکتی ہیں...
مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا....
ابھی یاد آنے لگے گا
"سن"
"ہاں"
"کچھ یاد آ رہا ہے...."
"کیا؟"
"میں نے ایک بار جُوا کھیلا تھا..."

"پھر؟"

"سارا دھن، ہیرے موتی لعل پنے داؤ پر لگا دیئے تھے۔"

"پھر؟"

"سب کچھ ہار گیا۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے اپنی پتنی کو داؤ پر لگا دیا۔"

"پتنی؟"

"ہاں ارملا کو بھی"

"کیا کہا؟"

"ہاں ارملا کو بھی داؤ پر لگا دیا اور ہار گیا۔"

"اچھی طرح یاد کر"

"ہاں سچ دروپدی ... اُس وقت ارملا کا نام دروپدی تھا۔۔

اچانک وہ چپ ہو گیا۔ اُسے لگا ... وقت اس کے اندر کچھ اس طرح متحرک ہے کہ کبھی وہ ہزاروں برس کی دوری پر نظر آتا ہے اور کبھی ہزاروں برس اِدھر لوٹ آتا ہے۔

اس نے کوشش کی کہ وہ وقت کی کوئی آواز نہ سن سکے، لیکن ایک آواز اس کی سماعت سے آٹکرائی اور کھڑی ہو گئی۔

اس کے خیالوں نے کہا "یہ آواز تمہیں سننا ہو گی۔"

پوچھا "کس کی آواز ہے"

درویودھن کی سبھا میں کھڑی دروپدی کی سُن! وہ کہہ رہی ہے کہ یدھشٹر جب اپنے آپ کو ہار چکے تو مجھے داؤ پر لگانے کا انھیں کیا حق تھا؟

سن رہا ہوں

"جواب دو"

اس کا جواب تو یدھشٹر بھی نہیں دے سکا تھا۔

اسی لئے تو یہ سوال ہزاروں برس سے ہوا میں معلق ہے۔

لیکن میں اس کا جواب کیسے دے سکتا ہوں۔

اس جنم میں تم نے پھر جوا کھیلا اور دھن، دولت، عزت اور جاہ و حشمت کے لئے زمینداروں کی بیٹی سے بیاہ رچایا۔

لیکن میں نے خود کو ہی داؤ پر لگایا اور ہار گیا۔

یہی تو آج کی دروپدی پوچھ رہی ہے کہ اے وقت کے یدھشٹر! تجھے اپنے آپ کو ہار کے بعد یہ حق کس نے دیا تھا کہ تو نے اسے بھی داؤ پر لگا دیا۔ آج وہ کسی درپودھن کے روبرو کھڑی ....

"چپ رہو"

اور گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

(۱۴)

اچانک ایک ہلکی سی روشنی ہوئی تو سامنے ایک عمارت دکھائی دی، جس کے بند دروازے کے پاس پہنچ کر اس کے پاؤں شل ہو گئے۔

یہ کون سی جگہ ہے؟ اس نے اپنے خضرِ راہ سے پوچھا

—— عدالت،

—— کیا یہ اساطیر کے مطابق مملکتِ الٰہیہ کی کچہری ہے۔

—— اے بیسویں صدی کے انسان! اس کے اندر اساطیر کا مذہبی قانون نہیں۔ اس کے اندر تیری آج کی عدالت ہے۔ جج بھی اور سرکاری وکیل بھی

—— اور میں؟

—— ایک ملزم

—— لیکن میری خطا؟

—— اندر چل کر پوچھ لو

—— لیکن جن شہروں میں، میں رہتا ہوں، وہاں تو مقدمے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

—— اسی لئے تو یہ عدالت تمہارے شہروں سے باہر ہے۔

—— پوچھنے سے کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں تھی، اس لئے وہ بند دروازے کو کھول کر عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔

سامنے ایک بہت بڑی دیوار تھی جس کے اوپر ایک تصویر آویزاں

تھی۔ کمرے میں روشنی بہت کم تھی، اس لئے وہ تصویر کو نہ پہچان سکا لیکن اتنا ضرور جان لیا کہ یہ تصویر حاکم وقت کی رہی ہوگی جس کے نام پر اس عدالت میں انصاف ہوتا ہے۔

اس بڑی دیوار کے پاس اُس تصویر کے نیچے، ٹھیک اُسی کی سمت میں ایک اونچا سا چبوترہ تھا جس پر ایک بڑی سی میز رکھی تھی، کاغذوں سے بھری ہوئی اور جس کے پاس ایک اونچی پشت والی کرسی پر ایک جج بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بدن کے سفید چوغے سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جج ہے۔

اس نے کمرے کو دائیں بائیں سے پوری طرح دیکھا۔ وہاں صرف ایک اور آدمی تھا جس کا چہرہ جج کی طرف تھا لیکن جس کے بدن پر سیاہ کوٹ تھا، جس سے اس نے اندازہ لگایا وہ ضرور سرکاری وکیل ہوگا

کمرے میں اور کوئی نہیں تھا

اُسے ہلکی سی ہنسی آگئی ـــــ جیسے دنیا میں صرف ایک ہی جج رہ گیا ہو، ایک ہی وکیل اور ایک ہی ملزم۔

اس کے قدموں کی چاپ سن کر سامنے بڑی دیوار کے پاس بیٹھے ہوئے جج کی نظر اس پر پڑی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہیں رکنے کو کہا جہاں لکڑی کا ایک کٹہرا تھا۔ ملزموں کا کٹہرا۔

وہ جاکر کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔

خیال آیا ـــــ عجیب عدالت ہے، کہیں کوئی آواز نہیں، کیا

عدالتیں یوں خاموش بھی ہوا کرتی ہیں۔

اس نے نہایت شائستگی سے پوچھا "حضور! مجھے کس لئے طلب کیا گیا ہے؟"

اس بڑی دیوار کی جانب سے منصف کی آواز آئی "آج تیری پیشی ہے، اب تاریخ اور آگے نہیں ڈالی جا سکتی تھی کیوں کہ تو جلد ہی اس ملک سے باہر جانے والا ہے۔"

"لیکن کیسی پیشی؟"

"تو تین سال تک سوچتا رہا کہ تیرے مقدمے کی سماعت نہ ہو...."

"لیکن کون سا مقدمہ؟"

آج سے تین سال پہلے تو نے خود ہی ایک درخواست دائر کی تھی

"میں نے؟"

"تجھے یاد نہیں۔"

"—— ہاں —— ایک درخواست دائر کی تھی... لیکن وہ بہت پرانی بات ہے۔"

وکیل نے میز پر سے ایک فائل اٹھائی اور دھیمے لہجے میں جج سے کہنے لگا ——

"حضور! یہ بہت خطرناک آدمی ہے.... کسی بات کا جواب واضح طور پر نہیں دیتا، آپ مجھے جرح کی اجازت دیں۔"

"اجازت ہے"، جج نے اشارہ کیا۔

سرکاری وکیل نے جیب میں سے رومال نکال کر، اپنے چشمے کے لینز صاف کئے، پھر ایک دو کاغذوں پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھا اور کٹہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تمہارا نام؟"

اسے ہنسی سی آ گئی، کہنے لگا "کیا آپ کے کاغذوں میں میرا نام نہیں؟ اگر آپ کو میرا نام بھی نہیں معلوم تھا تو مجھے بلایا کیسے؟"

وکیل کی پیشانی پر ہلکے سے بل نمودار ہوئے، وہ کہنے لگا "تمہیں معلوم ہے، تم پر کیا الزام ہے؟"

—— "نہیں!"

—— "قتل کا ——"

—— "قتل کا؟ کس کے قتل کا"

—— "تمہارے دوست کے قتل کے"

—— لیکن وہ تو ——"

—— "جس کے لئے تم نے درخواست گزاری تھی کہ وہ مل نہیں رہا..."

—— "اگر میں نے اُسے قتل کیا ہوتا تو درخواست کیوں دیتا۔"

جواب میں وکیل ہنس دیا، کہنے لگا۔

—— "اسی لئے میں نے تجھے خطرناک ملزم قرار دیا ہے، اچھا یہ بتاؤ! اسے گم ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

—— "تین سال ....."

"وہ تمہارا کتنا پرانا دوست تھا؟"

"بچپن کا"

—— "اسکول میں تمہارے ساتھ پڑھتا تھا؟"

—— "ہائی اسکول میں بھی، کالج میں بھی...."

—— "اس کی عمر"

—— "میرے برابر"

—— "صرف وہی ایک دوست تھا؟"

—— "ہاں .... صرف وہی"

—— "تمہارا کیا خیال تھا"

—— "یہی کہ دوستی عمر بھر کی ہوگی"

—— "پھر؟"

—— "اچانک وہ غائب ہوگیا"

—— "تو نے اسے تلاش نہیں کیا تھا؟"

—— "بہت ڈھونڈا —— ابھی تک ڈھونڈ رہا ہوں۔

وکیل مسکرایا، حیران ہوا اور کہنے لگا

—— وکیل صاحب! آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں کیا؟

لیکن اس کے اندر کچھ گھبراہٹ سی پیدا ہوئی۔ اس نے بھی وکیل کی طرح جیب میں سے رومال نکالا، لیکن عینک کو نہیں، پیشانی کو پونچھ کر صاف کیا، ماتھے پر اچانک کچھ اوس نمودار ہوئی تھی۔

وکیل ہنس پڑا۔

—— آپ مجھ پر ہنس کیوں رہے ہیں وکیل صاحب!

—— تم رومال سے پیشانی کو یوں رگڑ رہے تھے....

—— یہ کمرا بہت گرم ہے، میری پیشانی پر پسینہ

—— نہیں، تم ماتھے کو یوں رگڑ رہے تھے، جیسے ہر یاد کو ذہن سے محو کر دینا چاہتے ہو۔

وکیل کا چہرا بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کہنے لگا "تم دونوں دوست جب مل کر کتابیں پڑھتے تھے، تو اس وقت وہ کہانی کون سی تھی، جس کا تم دونوں پر بہت اثر مرتب ہوا تھا؟"

—— کئی تھیں

—— کوئی ایک ایسی، جو تمہارے دل کو کھینچتی تھی۔

—— پھر؟

—— رشی نے اس کے باپ کا نام پوچھا، تو وہ دوسرے دن آکر کہنے لگا "میری ماں کہتی ہے کہ میں نے کئی مردوں کی خدمت کر کے بیٹا لیا ہے، اس لئے کسی ایک کا نام نہیں دے سکتی اور رشی نے بچے کو اپنے سینے سے چمٹا لیا...."

—— "کیوں؟"

کیوں کہ وہ اتنا بڑا سچ بول سکا تھا —— بڑے مطمئن دل...

وہ اس عورت کا بچہ تھا جس کو سچائی سے کوئی خوف نہیں تھا۔

"تجھے معلوم ہے، یہاں صرف ایک جج ہے، ایک میں اور ایک تو..."

"ہاں ——"

"یہاں تمہارا کوئی گواہ نہیں۔"

—— کیوں ؟

—— کیوں کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کہانی کا آج بھی تم پر تھوڑا سا اثر باقی ہے، اس لئے تم اپنی گواہی آپ دو گے۔

—— پھر وکیل صاحب! آپ نے مجھے خطرناک کیوں قرار دیا ؟

—— کیوں کہ پچھلے برسوں والے تم، وہ نہیں ہو، جو پہلے تھے، تم کبھی کبھی سچ کو چھپانے کی کوشش بھی کرو گے۔

—— لیکن ؟

—— ایک جملے میں چھپا کر، دوسرے میں خود ہی منکشف کر دو گے

اس نے اپنا سر جھکا لیا، ایک دھیمی ہوک بھی اس کے اندر سے اٹھی اور پھر سر اٹھا کر کہا

—— ہاں، پوچھو وکیل صاحب! جو پوچھنا چاہتے ہو۔

—— ارملا کون تھی ....

—— میں اس سے بہت محبت کرتا تھا

—— اب نہیں کرتے ؟

—— جو زبان ہاں کہہ سکتی ہے وہ کاٹ لی گئی ہے ...

—— کس نے کاٹ لی تھی

—— میں نے

—— تیرے دوست نے تو نہیں کاٹی ؟

—— نہیں

—— تیرے دوست کو تیری محبت کا علم تھا ؟

—— اسے سب کچھ معلوم تھا

—— وہ اس پر خوش نہیں تھا کیا ؟

—— وہ بہت خوش تھا، بہت خوش تھا وکیل صاحب

—— پھر ؟

—— میری ماں خوش نہیں تھی

—— کیوں ؟

—— وہ چاہتی تھی . . . میں

—— وہ زمیندار کے گھر کی دولت چاہتی تھی

—— اپنے لئے نہیں، میرے لئے

—— اور تمہارا دوست ؟

—— وہ اس وقت پہلی بار مجھ پر بگڑا تھا۔ اس سے پہلے ہم اکٹھے رہتے تھے، ایک ہی کمرے میں . . . . اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا . . . .

—— تم نے اسے منایا نہیں ؟

—— کس زبان سے منا سکتا تھا ؟ میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا کہ جس زبان سے دوستی اور محبت کے عہد و پیمان کئے ہیں، وہ میں کاٹ چکا ہوں . . . .

—— لیکن زمیندار کی بیٹی کے ساتھ شادی کا اقرار کس طرح کیا ؟

—— کٹی ہوئی زبان کے ساتھ... دنیا کا ہر کام کٹی ہوئی زبان کے ساتھ ہو سکتا ہے وکیل صاحب !

—— پھر اس کے بعد تمہارا دوست تمہیں کبھی نہیں ملا ؟

—— فاصلے سے کئی بار دیکھا۔

—— کہاں ؟

—— وہ چپ ہو گیا۔ اس کے کانوں میں کئی پیڑوں کے پتے سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ کئی مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں اور کئی کتابوں کے اوراق ہلنے لگ گئے تھے۔

—— تم بولتے نہیں ؟

—— اگر میں کہوں کہ میں نے کئی بار رات کو چاندنی میں اسے دیکھا تھا ... کسی شاخ پر آئی پہلی کونپل میں ... اور ندی کے پانیوں پر تیرتے مندر کے کلس میں اور کسی کسی کتاب کے .....

وکیل ہنس دیا کہنے لگا —— "آج اگر کوئی عدالت کی کارروائی دیکھے تو سمجھے کہ ہم کالیداس کو پکڑ کر عدالت میں لے آئے ہیں۔"

اس نے پل بھر کے لئے آنکھیں موند لیں۔ شاید آنکھیں بھیگ گئی تھیں ... پھر کہنے لگا ——

—— میں شاید چھوٹا سا کالیداس ہو سکتا تھا لیکن ہو نہ سکا۔

کیا تم خوش نہیں ہو کہ تم نے وہ عہدہ پا لیا ہے جس پر تمہاری دنیا کے لئے

لوگ رشک کرتے ہیں۔

—— وکیل صاحب ....

—— یہ خاموشی کیوں؟

—— اس لئے کہ مجھے خوشی کے لفظی معنی بھول گئے ہیں۔

—— یہ عہدہ تم نے کس طرح پایا؟

—— وکیل کے اس سوال پر وہ چونک اٹھا۔ اسے وہ دن یاد آیا، جب ارملا نے اُس سے کہا تھا "کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کو لفظوں کی سزا نہیں دینی چاہیئے۔"

وہ آنکھوں میں التجا بھر کر وکیل کی طرف دیکھنے لگا

وکیل مسکرا دیا، کہنے لگا —— ایک بچہ تھا، جو ایک رشی سے رخصت لینے گیا تھا۔

اس نے سر جھکا لیا، آواز کانپنے لگی —— "جانے وہ کس زمانے کی بات تھی.... "

—— ہو سکتا ہے ....

—— کیا؟

—— کہ اُس زمانے میں وہ بچے تم ہی تھے۔

—— ایک لمحے میں وقت اور مقام بدل گئے....

وکیل کے منہ سے نکلے الفاظ اس کے کانوں میں اترے تو وہ، جو اس وقت ملزم تھا، ایک رشی کی کٹیا میں کُشا کے آسن میں بیٹھ گیا

پھر سینے میں ایک لمحے کا اطمینان پاکر، وہ وکیل کی طرف دیکھنے لگا

—— کیوں، میں نے درست نہیں کہا ؟ وکیل نے پوچھا

—— شاید نہیں....

—— تمہیں وہ بچہ ہونا پسند نہیں کیا ؟

—— وکیل صاحب! جو زبان ہاں کہہ سکتی ہے، وہ کاٹ لی گئی ہے۔

وکیل نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا، پھر ایک بار اونچی کرسی پر براجمان منصف کی طرف دیکھا، جیسے ملزم کے لئے رحم کی اپیل کر رہا ہو۔

لیکن منصف خاموش تھا

وکیل نے پھر ملزم کی طرف دیکھا —— کہا

" کیا یہ سچ ہے کہ تمہارا یہ عہدہ بھی زمیندار کی بیٹی نے ہی دلوایا ہے، میرا مطلب ہے —— تیری پتنی نے "

—— پہلا جملہ ہی کافی تھا وکیل صاحب!

—— اُسے پتنی کہنے سے احتراز کیوں ؟

—— احتراز نہیں ہو سکتا ہے، خوف ہو سکتا ہے

—— کس طرح ؟

—— کیوں کہ احتراز کا تعلق قانون سے ہے، اور خوف کا دل سے

—— اور تن کے ساتھ ؟

وکیل ہنس پڑا، تو ملزم کے منہ میں ایک تلخی سی گھل گئی لیکن وہ خاموش رہا۔

اُس چپ سے اسے اپنے تن کی وہ چپ یاد آ گئی ۔ جب اس نے شادی کی پہلی رات زمیندار کی بیٹی کے بستر پر پاؤں رکھا تھا۔

تن گونگا ہو گیا تھا۔

اس نے کپڑوں کو پھاڑنے کی طرح اپنے جسم سے نوچا تھا لیکن جسم بولتا ہی نہیں تھا۔

اس نے تن کی آواز کو تلاش کرنے کے لئے تن کے اندھے کنوئیں میں رسی لٹکائی تھی لیکن صرف کنوئیں کی چرخی کی چیخ سنائی دی تھی ـــــ جیسے تن کی چپ تلملا کر رو پڑی ہو۔

آج اسے وہ رات یاد آ گئی، تو اس کی چاہت دھیمے سے مسکرا دی، کہنے لگی "اگر اس رات وہ بستر ارملا کا ہوتا؟ ..."

چاہت نے جادو کر دیا تھا اور وہ سوچنے لگا۔ تن کے ساز کو چھیڑنے کے لئے ہاتھوں میں ادب بھرا جاتا ... میں اس کے اعضا کے خم و پیچ کو یوں چھوتا جیسے کوئی کسی ساز کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ پوروں سے تن کی نوکوں کو ٹٹولتا جیسے کوئی تاروں کو سُر میں لاتا ہے، تار، آخری سروں تک ہل جانے اور سارے انگ سروں میں ڈھل جاتے، پاؤں کے 'سا' سے لے کر پیشانی کے 'سا' تک۔

اور جب کھرج اور گندھار کے جادو میں وہ لپٹ گیا تو ساز کے کسی تار کو توڑتی دکیل کی آواز آئی۔

ـــ سو پھر تمہارا دوست کبھی تم سے نہیں ملا؟

—— نہیں، پھر کبھی نہیں ملا، اس نے لڑکھڑاتے ہوئے جواب دیا۔
—— کبھی دور سے، دیکھا بھی نہیں ؟
—— کبھی راہ باٹ میں دیکھا ہو شاید.....
—— کون کون سی سڑک پر ؟
—— صرف اسی سڑک پر
—— کون سی ؟
—— وہ، جس پر سے کئی بار رات کے وقت میں گزرتا تھا۔
کہاں ؟
—— اُس کے پاس، جو یہ سب کچھ دلا سکتی تھی
—— اور تمہارا دوست ؟
—— اندھیرے میں موڑ کر کھڑا رہتا تھا
—— کس لئے ؟
—— مجھے اس راستے سے موڑنے کے لئے
—— تمہارے ہاتھوں میں کیا ہوا کرتا تھا ؟
—— کئی طرح کی رشوتیں ....
—— اور وہ تمہارا دوست ؟
—— میرے ہاتھوں کو توڑ دینا چاہتا تھا۔
—— تم اسے اپنے راستے سے کیوں ہٹاتے تھے ؟
—— اسی طرح..... جیسے کسی کو راہ میں سے ہٹایا جاتا ہے.....

وکیل مسکرا دیا، کہنے لگا ــــ "سو آج بھی تم کہتے ہو کہ تم نے اُسے قتل نہیں کیا؟"

ــــ میں ٹھیک کہتا ہوں، میں نے اُس کو قتل نہیں کیا! میں ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے۔

ــــ تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا؟ اور کہاں؟

ــــ اُسی سڑک کے موڑ پر..... جس دن وہ بھی میرے ساتھ تھا۔

ــــ وہ کون؟

ــــ وہی زمیندار کی بیٹی.....

ــــ اس وقت تمہاری شادی ہو چکی تھی۔

ــــ ہو چکی تھی.....

ــــ پھر تم اسے اپنی پتنی کیوں نہیں کہتے؟

ــــ قانون کہتا ہے، میں نہ بھی کہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔

ــــ اچھا یہ بتاؤ، اس دن تم اسے اپنے ساتھ کیوں لے کر گئے تھے؟

ــــ یہ میری مرضی نہیں تھی، اس کی تھی یا پھر اُس کی جس نے بلوایا تھا۔

ــــ کیا وہ بھی رشوت ہی کا ایک حصہ تھا؟

ــــ ہاں، لیکن جسے نہ تو وہ بینک میں رکھ سکتا تھا نہ گھر میں، صرف ایک گھنٹے کے لئے خواب گاہ کے اندر.....

ــــ اُس دن اندھیرے کے اس موڑ پر کھڑے ہو کر اس نے مجھ پر زور کا ایک تھپڑ مارا تھا۔

—— اور جواب میں تم نے ؟

—— صرف ہاتھ سے اسے ایک طرف ہٹا دیا تھا ....

—— اور وہ وہاں اندھیرے میں گر گیا تھا ؟

—— ہاں، وہ گر پڑا تھا، اسی لئے میں جلدی سے گزر گیا تھا ...

—— تو کیا معلوم، اسے بہت گہری چوٹ آئی ہو ؟

—— ضرور آئی ہو گی ...

—— تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ وہاں مر نہیں گیا تھا ؟

—— نہیں

—— تو کیسے جانتا ہے ؟

—— میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں ...

—— کس طرح ؟

—— میرے پاس اس کا ثبوت ہے

—— کیا ؟

وکیل نے ثبوت مانگا، اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، کہنے لگا ——

"وکیل صاحب! اگر وہ واقعی مر گیا ہوتا تو میری آنکھوں میں وہ نمی نہیں آ سکتی تھی .... میں ابھی تک اپنے آپ پر رو سکتا ہوں اور اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے ... "

—— کیا یہ ثبوت کافی ہے ؟

وکیل نے پھر پوچھا، تو وہ بھڑک اٹھا، کہنے لگا ——

"ثبوت اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے ... ہوتے ہیں، کسی کو سمجھانے کے لئے نہیں۔"

وکیل نے بات کا رخ موڑ دیا — کہا "لیکن تیری عورت نے جو کچھ بھی کیا تیرے لئے کیا، کیا یہ اس کی قربانی نہیں تھی؟"

— نہیں، پہلی بات تو یہ کہ اس نے جو کچھ بھی کیا، اپنے لئے، یہ سب کچھ مجھے نہیں چاہیئے تھا، اس کو چاہیئے تھا، میرے ہاتھوں میں پہلی رشوت اس نے تھمائی تھی۔

— اور دوسری بات؟

— یہ کہ وہ قربانی نہیں تھی — وہ جو کوئی بھی تھا، زمیندار گھرانے کا پرانا آدمی تھا — اور اس نے، میرا مطلب ہے — زمیندار کی بیٹی نے اسی تک پہنچنا تھا میں صرف ایک قانونی راستہ تھا، جس پر چل کر اس تک جایا جا سکتا تھا....

اب تم آپس میں کس طرح رہتے ہو؟ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہو؟

بہت مطمئن — ہم ایک دوسرے کے جسم کا جھوٹا جیتے ہیں۔

— لیکن اس شادی پر رضامندی تم ہی نے ظاہر کی تھی؟

— میری رضامندی صرف میری ماں کی ضد تھی، اس کا کوئی دوسرا روپ نہ تھا۔

— پھر بعد میں تمہاری ماں اس پر پچھتائی تھی یا نہیں؟

— وہ بہت جلدی مر گئی، پچھتاوے کا دن دیکھنے سے پہلے.....

صرف کئی بار خیال آتا ہے...

—— کیا ؟

کہ اگر اس کی اس طرح، اتنی جلدی موت واقع ہونی تھی تو اس سے کچھ دن پہلے ہی....

—— تمہارا مطلب ہے کہ تمہاری شادی رچانے سے پہلے ہی موت اسے سنبھال لیتی ؟

—— ہاں

—— کیا اپنی ماں کے بارے میں یوں سوچنا تمہاری قتل کی اُس نیت کا اظہار نہیں، جس کے ذریعے ممکن ہے، تم نے اپنے دوست کو ٹھکانے لگایا ہوگا، حالانکہ تم اعتراف نہیں کر رہے۔

—— آپ نہیں سمجھیں گے وکیل صاحب۔

وکیل نے منصف کی طرف دیکھا —— جیسے کہہ رہا ہو کہ ملزم کے باطن میں چھپی ہوئی اس کی قتل کرنے کی نیت صاف نظر آتی ہے، اس میں مزید تفہیم کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اس کی صفائی میں کچھ سننے کی

لیکن منصف نے پہلے تو بڑی گہری نظر سے ملزم کا جائزہ لیا، پھر وکیل کی طرف دیکھا اور ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا کہ —— "وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُسے سنا جائے۔"

وکیل نے کچھ تھکی ہوئی نگاہوں سے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی طرف دیکھا اور کہا "ماں کی موت کی خواہش ظاہر کر کے بھی تم اسے قتل کی نیت تسلیم

نہیں کرتے۔"

—— نہیں، کیوں کہ میں ماں سے بہت محبت کرتا تھا، اسی لئے اُس کی ضد کی قربان گاہ پر اپنی ارملا کی قربانی پیش کر دی تھی۔

وکیل طنزاً مسکرایا "لیکن اس کی موت کی تمنا پیار کا بہت اعلیٰ ثبوت ہے۔"

اس نے جواباً تبسم کیا، کہنے لگا ——

—— وکیل صاحب! آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ کو ہر بات کے لئے ثبوت چاہیئے... تو سنو!

ایک بہت بڑا پرہیزگار تھا، اُس نے ایک بادشاہ کی بیٹی سے شادی کی اور اس شہزادی —— رینوکا کے گھر پانچ بیٹے ہوئے... سن رہے ہیں نا۔

—— ہاں سن رہا ہوں... وکیل نے یکبارگی ہنس کر منصف کی طرف دیکھا —— اور پھر ملزم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ سنانے لگا —— "ایک بار شہزادی رینوکا ندی میں نہانے گئی، تو وہاں ایک منقش رتھ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گئی... گھر لوٹی تو اس کے عبادت گزار خاوند نے اپنی ریاضت کے بل پر وہ بات جان لی۔ اسے بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے اپنے چار بیٹوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اپنی ماں کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔

وکیل کی توجہ، ملزم کے اس بیان کی دل کشی نے اپنی طرف کھینچ لی اور وہ گہری سنجیدگی سے سن کر بولا —— پھر؟ بیٹوں نے واقعی ماں کو ہلاک

کر دیا ؟

—— نہیں، وہ ماں کی محبت سے مسخر ہو گئے۔ انھوں نے ماں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس پر اُس زاہد شب زندہ دار کو اور بھی طیش آیا تو اُس نے اپنے چاروں بیٹوں کو پتھر ہو جانے کی بد دعا دی اور وہ سب پتھر کی مورتیاں بن گئے۔

—— پھر ؟

پانچواں سب سے چھوٹا بیٹا پرسورام تھا، وہ گھر لوٹا تو زاہد باپ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی ماں کو ہلاک کر دے تو پرسورام نے اُسی وقت تلوار سے ماں کا سر تن سے جدا کر دیا۔۔۔ لیکن جانتے ہو وکیل صاحب کہ آگے کیا ہوا ؟

—— کیا ؟

—— عبادت گزار باپ نے اپنے حکم کی تعمیل دیکھی تو وہ خوش ہو گیا اور بیٹے سے کہنے لگا کہ وہ اس کا صلہ مانگے ! تو کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں وکیل صاحب کہ اس نے کیا صلہ مانگا۔

—— کیا ؟

—— کہ اس کی ماں زندہ ہو جائے اور بھائی بھی جو پتھر بن گئے تھے اپنی اصل کو لوٹ آئیں۔

اب سمجھے وکیل صاحب

—— تمہارا مطلب ہے کہ :

—— میں بھی ایک پرسورام ہوں، ماں نے میری شادی کا پاپ کمایا، اس لئے اس کی موت کی کامنا کر سکتا ہوں —— اگر وہ گھڑی گزر جاتی، جس گھڑی ماں نے ضد کرنی تھی، تو میں شادی اپنی چاہت کے مطابق کر لیتا اور پھر اس کے بعد اپنی ماں کو اسی طرح زندہ دیکھنے کی تمنا کرتا جیسے پرسورام نے کی تھی۔

وکیل نے اپنی ندامت آلود نگاہوں کو ملزم کے چہرے سے ہٹا لیا۔

وہ پھر کہنے لگا... "لیکن میرا، آج کے آدمی کا المیہ یہ ہے وکیل صاحب کہ نہ تو میں کسی کو مار سکتا ہوں اور نہ ہی جلا سکتا ہوں... میں بہت کمزور آدمی ہوں.... دیکھیں نا... میں نے اسے جنگلوں میں تنہا چھوڑ دیا۔"

وکیل حیران سا ہو گیا، پوچھنے لگا، جنگل میں کس کو ؟

—— کچھ نہیں —— اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

ایک پل وکیل کو شبہ ہوا کہ ملزم شاید اپنے حواس کھو بیٹھا ہے لیکن اب تک کی اس کی ساری باتیں ہوش کی گواہ تھیں، اس لئے وکیل کے شبہے نے دوسری کروٹ لی — جو سراغ ابھی تک نہیں مل رہا تھا، شاید اچانک ہونٹوں سے نکلے اس جملے سے آشکارا ہو سکے۔

پوچھنے لگا — "تو تم نے اسے جنگل میں تنہا چھوڑ دیا..."

جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا۔

وکیل نے پوچھا — "تمہیں یاد ہے، وہ کس دن کی بات ہے ؟"

—— کیا ؟ وہ وکیل کے منہ کو تکنے لگا، جیسے وہ سوال نہ سمجھا ہو۔

"جس دن تم اُسے جنگل میں لے گئے تھے، اور وہاں تنہا چھوڑ دیا تھا"
اب ملزم کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ناچی لیکن جیسے ہونٹوں پر آکر رو پڑی ہو، کہنے لگا ـــــ "ہاں وکیل صاحب! میں نے بڑی معصوم اور بہت ہی پیاری سی لڑکی کو ایک جنگل میں اکیلا چھوڑ دیا۔۔۔"

ـــــ تم کس کی بات کر رہے ہو؟

ـــــ ارملا کی۔۔۔۔

ـــــ ہوں ۔۔۔۔ وکیل پر چپ مسلط ہو گئی۔

ـــــ مجھے اچانک ایک بات یاد آگئی تھی ـــ وہی بتانے لگا ہوں۔

ـــــ کیا؟

ـــــ ایک دن ـــ جب ہم سب لوگ پکنک سے واپس لوٹے تو، راستے میں ایک پہاڑی پر ایک مندر پڑتا تھا، ارملا وہ مندر دیکھنا چاہتی تھی، لیکن باقی لوگ اس بلندی پر چڑھنے کے لئے تیار نہ تھے ۔۔۔۔ سبھی تھکے ہوئے تھے۔

ـــــ پھر؟

"میں اور ارملا پہاڑی پر وہ مندر دیکھنے چلے گئے تھے۔ اس لئے ساتھیوں سے بچھڑ گئے تھے جو بیرونی پگڈنڈی گاؤں کی طرف آتی تھی، وہ بہت لمبی تھی اور اگر ہم راستے میں پڑتے ایک جنگل میں سے ہو کر گزرتے تو بہت جلدی گاؤں پہنچ جاتے۔

ـــــ تو آپ لوگ جنگل میں سے ہو کر گزرے؟

—— عشق کا یہ بہت عجیب ہوتے ہیں وکیل صاحب! ہم مندر سے اتر کر جنگل کی راہ ہو لئے تو اچانک میں نے کسنبہ کا ایک پھول توڑ کر ارملا کے بالوں میں اڑس دیا اور ایک پھول ہتھیلی پر رگڑ کر اس کا رنگ اس کی پیشانی پر لگا دیا.... آپ جانتے ہیں کیوں؟

—— کیوں؟ وکیل کچھ مسکرا سا پڑا لیکن ملزم نے دیکھا نہیں، اس کا ذہن دور جنگل میں تھا، کہنے لگا —— "جب میری نانی زندہ تھی، تو ایک دوپہر کو جب ہم جنگل میں سے گزر رہے تھے، تو اس نے کسنبہ کے پھول توڑ کر ان کی پتیاں سب کے ماتھے پر مَل دی تھیں.... اپنے بالوں میں بھی پھول لگائے تھے، ماں کے بالوں میں بھی، آپ جانتے ہیں کسنبہ کے پھول کو اگنی شکھشا بھی کہتے ہیں۔

—— لیکن....

"نانی کہا کرتی تھیں —— جنگل میں روحیں ہوتی ہیں اور اگر بالوں میں کسنبے کے پھول ہوں، گلے میں رنگین موتی اور ماتھے پر کسنبے کا سرخ رنگ تو جنگل کی روحیں، راہ گیروں کو کوئی دکھ نہیں دیتیں اور نہ ہی راہ چلنے والے راستہ بھولتے ہیں....

—— پھر اس دن تم نے ارملا کو جنگل میں تنہا چھوڑ دیا؟

—— نہیں وکیل صاحب! اس دن تو اس کے ماتھے پر کسنبے کا رنگ لگایا تھا.... اس دن نہیں —— بعد میں.... یہ دنیا بھی تو بھیانک جنگل ہے، اس بھیانک جنگل میں، میں نے اسے تنہا چھوڑ دیا.... لیکن نہیں، اگنی شکھشا

کی ریت میں ہی بھول گیا ۔۔۔۔

—— ہاں ، لگتا ہے ، تم جھوٹ نہیں بول سکتے ۔

وکیل نے دھیمی آواز میں کہا اور وہ جو ملزم تھا ، ہولے سے ہنس دیا ، کہنے لگا ——

جھوٹ نہیں بول سکتا ، لیکن جھوٹ کو آنکھوں سے دیکھ کر کبھی خاموش رہ سکتا ہوں ۔۔۔۔ اکثر رہتا ہوں ——

—— مثلاً ؟

—— مثلاً اس عورت کو لوگ جب میری بیوی کہتے ہیں تو میں چپ رہتا ہوں ۔۔۔۔

—— اور ؟

اور جب میرے سامنے لاکھوں کے بجٹ پر دستخط ہوتے ہیں تو اس کی کتنی رقم کہاں لگتی ہے اور کتنی کہاں جاتی ہے ، سب جانتا ہوں اور چپ رہتا ہوں ۔۔۔

کون سے بجٹ ؟

نئے محکموں کے ، نئی ملوں کے ، نئی خرید کے یا کسی نہ کسی چیز کی پروموشن کے ۔۔۔۔ مثلاً تعلیم کے ۔۔۔۔ آرٹ کے ۔۔۔۔ کلچر کے

—— اس چپ کی عادت تمہیں کب پڑی ؟

—— اُس دن سے ، جب ماں کی ضد کے آگے چپ سادھی تھی ۔

—— پھر ؟

—— پھر جب میرا دوست مجھ سے بچھڑنے لگا تو بھی میں چپ رہا

—— پھر ؟

"پھر اس رات جب میری کبھی جانے والی عورت میری نوکری کے کاغذات پر دستخط کروا کر لائی تھی .... اور صرف اس رات ہی نہیں، اب بھی کئی راتیں، جب مجھے علم ہوتا ہے کہ وہ کہاں گئی تھی اور وہ کہتی ہے کہ وہ کچھ خریدنے گئی تھی، میں چپ رہتا ہوں ... ہاں چپ ... ایک بات ہے۔"

—— کیا ؟

"مجھے اپنے گھر سے بازار کی باس آتی ہے .... خاص طور پر اپنے بستر میں سے۔"

—— اس کا کیا مطلب ہے ؟

—— اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا دوست ابھی زندہ ہے۔

—— اس کا زندہ ہونے کا اس باس سے تعلق ہے ؟

—— وکیل صاحب! میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ وہ اگر مر گیا ہوتا تو مجھے کسی بھی غلط چیز سے باس اٹھتی محسوس نہ ہوتی... جس طرح...

—— جس طرح کیا ؟

—— جس طرح —— اگر وہ مر گیا ہوتا، تو مجھے کسی بھی اچھی چیز سے خوشبو نہیں آ سکتی تھی۔

—— تم عجیب آدمی ہو .... اچھا یہ بتاؤ! تم نے اب تک اپنے عملوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا آخر یہ سب کچھ تو تیرے ہاتھوں ہوا۔

—— ہاں، میں نے جوا کھیلا

وکیل ہنس پڑا، کہنے لگا —— "اور اتنی دولت و ثروت، جاہ و حشمت جوئے میں جیت لی۔"

ملزم کی آنکھوں میں غیظ کی چنگاری بھڑکی، وہ کہنے لگا —— جوئے میں سب سے پہلے اپنا آپ ہارا، پھر اپنی زندگی سب سے بڑے دوست کو اور پھر ارملا کو... جیسے یدھشٹر نے اپنے بھائیوں کو داؤں پر لگایا تھا اور ہار گیا تھا۔ پھر اپنے آپ کو اور پھر دروپدی کو....

وکیل مسکرایا —— سو آج کے پانڈو! تو نے بھی جوا کھیلا۔

—— ہاں! اُسی طرح مگر دھن دولت کے لالچ میں نہیں۔

—— پھر کس لئے؟

—— جس طرح پانڈو نے کھیلا تھا اپنے بزرگ دھرت راشٹر کے حکم کی تعمیل کے لئے، میں نے ماں کا حکم مانا تھا۔

—— لیکن تمہیں حکم کی تعمیل پر پچھتاوا ہے؟

—— ہاں! یہ زمانے کا فرق ہے، آج کے آدمی کے پاس منطق ہے۔ شک ہے، دلیل ہے، پچھتاوا ہے۔

—— لیکن من کے جنگلوں میں بھٹکتی، تیری دروپدی تیرے ساتھ کیوں نہیں؟ نہ تیرا دوست تیرے ساتھ ہے..... پانڈو تو بنوں میں بھی اکٹھے تھے۔

—— یہ بھی زمانے کا فرق ہے وکیل صاحب! ہم سب بھٹک رہے ہیں اپنے اپنے بنوں میں، یہ تنہائی بھی اس کی دین ہے....

"تم سچ مچ دل چسپ آدمی ہو.... باتوں ہی باتوں میں تم اپنی عام بات کو بھی خاص بنا لیتے ہو۔"

—— کس طرح ؟

—— جس طرح تو نے اپنی ارملا کو دروپدی کے برابر لا کھڑا کیا۔

—— ارملا کی جنم کہانی بھی دروپدی کے جنم کی داستان سے مماثل ہے۔

—— وہ کس طرح ؟

وکیل کے چہرے پر استعجاب کی برق چمک گئی۔

—— کس طرح ؟ وکیل نے پھر استفسار کیا۔

—— آپ جانتے ہیں کہ دروپدی ایک ہون کنڈ میں سے پیدا ہوئی تھی اک اگنی میں سے۔

—— ہاں

—— ارملا بھی ایک اگنی کنڈ سے پیدا ہوئی تھی.... اُس کے ماں باپ ہون کنڈ جیسے برگزیدہ تھے لیکن اُن کے کنڈ میں اس کی ماں کے روپ پر فریفتہ ہو کر ایک راکشش نے انتقام کی آگ روشن کی —— ماں ندی میں ڈوب کر مر گئی.... باپ کشکول لے کر فقیر ہو گیا....

—— لیکن یہ ساری کہانی تو دروپدی کی نہیں تھی۔

—— یہ بھی عہد کا فرق ہے... جس طرح آج کی محبت کو کوئی ہون کنڈ نہیں کہتا.... آج کے راکششوں کو کوئی راکشش نہیں کہتا، آج کی نیکی کا کوئی صلہ نہیں دیتا اور آج کی برائی کو کوئی بد دعا نہیں دیتا۔

وکیل کی آنکھوں میں ملزم کے لیے محبت امڈ آئی، اس نے ملائم سی آواز میں کہا

سو تمہارے بیان کی رو سے، تم پر تمہارے دوست کے قتل کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

—— اسے گنوا دینے کا الزام لگتا ہے وکیل صاحب

—— وکیل متحیر ہوا، پوچھا —— کیا یہ الزام تمہاری نظر میں بہت بڑا الزام ہے؟

"ہاں وکیل صاحب! یہ خاموشی کا الزام ہے، بہت بڑا اور بہت دور تک پھیلا ہوا —— میرے بستر سے لے کر دنیوی اقتدار کی کرسی تک پھیلا ہوا ... ہر ملک کے اقتدار کی کرسی تک۔"

وکیل کا چہرا سنجیدہ ہو گیا، اس نے آہستہ سے کہا —— لیکن اے آج کے انسان! یہ الزام تو ہر عہد میں تازہ رہا ہے ...

ملزم ہنسا، کہنے لگا —— کیا وقت کا پھیلاؤ الزام کو بری الذمہ قرار دے دیتا ہے؟

وکیل نے کچھ نہیں کہا

وہی کہنے لگا —— دیکھنا! کس عہد کی بات ہے، اس زمانے کی جب دُریودھن کے دربار میں دروپدی کو گھسیٹ کر لایا گیا، اور بھری محفل میں روندی گئی، دروپدی نے اپنے سرتاج یدھشٹر سے ایک سوال پوچھا۔

—— کیا؟ وکیل نے آہستگی سے پوچھا

—— یدھشٹر جب اپنے آپ کو ہار چکے تو انھیں کیا حق حاصل تھا مجھے داؤ پر لگانے کا ؟

یدھشٹر نے کیا جواب دیا

—— کوئی جواب نہیں دیا وکیل صاحب، کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ بھرے دربار میں بھیشم پتاماں نے کہا تھا کہ دروپدی کا سوال بہت برمحل اور گہرا ہے لیکن اس سوال کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ کئی سوالات صدیوں سے ہوا میں معلق ہیں اور انسان صدیوں سے چپ ہے۔

—— ملزم !

" ہاں وکیل صاحب ! اُرملا کا بھی یہی سوال ہے اور میں خاموش ہوں .... میں چپ کا قصوروار ہوں "

وکیل کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر منصف کی طرف دیکھتا ہوا دھیمے لہجے میں ملزم سے پوچھنے لگا۔

—— تمہارا کیا خیال ہے، اگر تمہاری جگہ تمہارا دوست ہوتا تو وہ اس سوال کا جواب دیتا

ملزم نے ایک گہرا سانس کھینچا، پھر تھکی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

وہ چپ نہیں رہ سکتا تھا، اسی لئے وہ میرے پاس سے چلا گیا ....

وہ میری طاقت تھا .... میری توانائی

—— اگر تمہاری جگہ وہ ہوتا، دنیا کی جو آسائشیں اور سکھ تمہارے

پاس ہیں، اگر وہی اُس کے سامنے ہوتے ؟

ملزم ہنسا، اتنا کہ رومال کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں میں امڈ آئی نمی کو پونچھا اور کہنے لگا ۔۔۔ وہ میری جگہ ہو نہیں سکتا تھا وکیل صاحب وہ اُس سڑک کو توڑ دیتا، جس سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ یہ شکست اس کے پاؤں کے لئے نہیں تھی، ایک بات کہوں وکیل صاحب!

—— ہاں

—— ان راستوں پر چلنے کے لئے انسان کو ہمت نہیں چاہیئے ....

اور یہ صرف اُس کے پاس تھی۔

—— اور تم ؟

—— میں بہت کمزور آدمی ہوں ..... چلا، تو بس چلتا گیا۔

—— تم اس راستے سے واپس جانا چاہتے ہو ؟

—— وکیل کے اس سوال پر ملزم پھر ہنس دیا، کہنے لگا ۔۔۔ عجیب سوال ہے ؟

—— کیوں ؟

—— کیونکہ کچھ چاہ سکنے کے لئے ہمت چاہیئے۔

—— تو تم نہیں چاہتے، لیکن نہ چاہنے کے لئے بھی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے

—— ہاں وکیل صاحب! ہاں اور نہ دونوں کے لئے، میں دونوں سے دور آچکا ہوں ....

وکیل نے میز کے پاس جھک کر ایک کاغذ پر کچھ لکھا، پھر ملزم کی طرف دیکھتا ہوا کہنے لگا ـــــ تمہیں معلوم ہے کہ ان ساری باتوں سے تمہارے مقدمے کی کارروائی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

ـــــ ٹھیک ہے، اسے بھی میری طرح کاغذوں میں بھٹکنے دیا جائے...

اس نے اچاٹ من کے ساتھ کہا لیکن پھر پوچھنے لگا "مجھے بہت پیاس لگی ہے، مجھے کہیں سے پانی مل سکتا ہے"؟

ـــــ پانی؟

اس نے کچھ جھجک کر کوٹ کی جیب کو ٹٹولا، پھر کہنے لگا ـــــ میرے پاس تھوڑی برانڈی ہے.... میرا مطلب ہے وہسکی.... کیا پی سکتا ہوں؟

وکیل نے منصف کی طرف دیکھا تو منصف دھیمے سے مسکرا دیا، اس پر وکیل نے ملزم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ـــــ تیری مرضی....

اس نے عجلت سے چھوٹی سی بوتل میں پانچ چھ گھونٹ لئے تو کچھ پیاس بجھی اور اس نے وکیل کی طرف دیکھا۔

وکیل نے وہی سوال، کاغذوں میں سے چن کر، پھر دوہرایا...

"تو تمہارا دوست گم ہو گیا ہے، تین سال سے مل نہیں رہا"؟

اس نے تصدیق کی ـــــ ہاں تین سال سے نہیں مل رہا

وکیل نے اپنا شبہ بھی پھر دوہرایا ـــــ شاید وہ قتل کر دیا گیا ہو...

اس نے پھر اسی طرح عذر پیش کیا ـــــ نہیں وہ زندہ ہے...

—— کوئی ثبوت ؟ وکیل کی آواز ٹھنڈی اور کاروباری ہو گئی۔

—— میں ثبوت دے چکا ہوں، اب دوسری بار نہیں دوں گا۔ اس نے زچ ہو جانے والے لہجے میں کہا!

—— لیکن تم اسے تلاش کیوں نہیں کرتے ؟

—— اگر تلاش کر پاتا، تو آپ کے یہاں درخواست کس لئے گزارتا۔

—— اسے تلاش کرنا کس کا کام ہے ؟

—— ہم سب کا ...

—— کمرے میں چپ چھا گئی

—— کمرے کی بڑی دیوار والی سمت پہلے ہی خاموش تھی ۔ دیوار پر لگی تصویر اور نیچے اس کی سمت میں بیٹھا سفید چوغے والا منصف بھی، جیسے دیوار ہی کا ایک حصہ تھے۔ صرف اس جانب چوبی کٹہرے میں کھڑا ہوا ملزم اور اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا سیاہ کوٹ والا وکیل بول رہے تھے اب چپ ہو گئے تو کمرا بھیانک لگنے لگا۔

وہ چوبی کٹہرے پر اپنی بائیں کہنی کو ٹکا کر خالی خالی آنکھوں سے کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا اور بغیر پانی کے پیئے ہوئے وہسکی کے گھونٹ اُس کے سینے میں بہت گرم گرم لگنے لگے۔

سگریٹ کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے جیب میں سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگائی۔

—— یہ ننگی اینٹوں کا کمرا شاید بہت پرانا ہے اور شاید یہاں روز

پچھری نہیں لگتی، وہ کونوں کھدروں میں لگے مکڑی کے جالوں کو دیکھتا، اچانک سفید چوغے والے جج کو دیکھنے لگا۔

سوچنے لگا۔ کم بخت پتھر کے بت کی طرح بیٹھا ہوا ہے، نہ بولتا ہے، نہ ہلتا ہے، صرف پلکیں جھپکا کر دیکھتا جا رہا ہے۔

تو اسے خیال آیا — اگر اس کی پلکوں میں بھی جنبش نہ ہوتی تو وہ سمجھتا کہ وہ سچ مچ کا پتھر کا مجسمہ ہے۔

اور پھر وہ اپنے خیال پر ہنس دیا — اگر دنیا کی ہر عدالت میں انصاف کا ایک بت —— اس نے خود ہی اپنی سوچ میں ترمیم کر دی —— اور خود کو دلیل سے قائل کرنے لگا —— اگر بھگوان پتھر کا بنایا جا سکتا ہے تو انصاف کیوں نہیں؟ بلکہ وہی تو سچ ہوگا —— تشکیک نے سر اٹھایا لیکن وہی تشکیک اس کے ہونٹوں کے پاس آکر ہنس پڑا "پہلے کون سی شنوائی ہوتی ہے"؟

اس نے ہاتھ کی ہتھیلی کے ساتھ ہونٹوں سے اس تشکیک کو پونچھ ڈالا، کہنے لگا — زبان صرف حکومتوں کی ہوتی ہے، انسان تو کب سے چپ ہے...

آج اس عدالت میں چپ کا الزام ..... خود ہی اس نے اپنے سر لیا تھا۔ اس بات سے اسے کسی قدر تسلی ہوئی۔

اور اچانک ایک بہت پرانی گفتگو اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ جب پانچوں پانڈو، اپنی ماں کنتی سمیت، جنگل میں مارے مارے پھر رہے تھے تو وہاں ہڈمبا نام کی راکھشنی بھیم کے وجود کی طاقت دیکھ کر اس پر

فریفتہ ہوگئی تھی ۔ اور ایک خوبصورت شہزادی کا روپ دھار کر آگئی ۔۔۔
اُس قدیم کہانی کو اس نے جھٹکے کے ساتھ درست کیا ۔ نہیں ، زمیندار کی بیٹی کا روپ دھار کے آئی ۔۔۔۔

اور وہ کہانی کے بارے میں سوچنے لگا ۔۔۔۔ مہابلی بھیم نے اُس راکھشسنی کا راز جان لیا ، تو پھر بھی اس کی خواہش پوری کی ۔۔۔۔ لیکن مشروط طور پر ۔ اس سے کہا کہ جب تمہارے ہاں ایک بیٹا جنم لے گا ، تو میں اپنی زندگی میں واپس آجاؤں گا ۔

من ، جیسے ننگے پاؤں جنگلوں کی طرف بھاگ نکلا ، لیکن ان جنگلوں کی طرف جو بھیم کے عہد میں تھے ۔۔۔۔ مگر وقت اور مقام کا شعور جاگا تو ننگے پاؤں میں کئی کانٹے چبھ چکے تھے ۔

کتنا قدیم عہد تھا ۔ وہ سوچ کی گہرائیوں میں اتر گیا ۔ سال بھر بعد اپنی زندگی میں واپس لوٹ آنے کا راستہ اس نے متعین کر لیا لیکن اب ، صدیوں کے بعد یہ کس نوعیت کا نیا عہد طلوع ہوا کہ وہ پرانے جیسا ابھی بنیا نہیں ، کیا سال بھر بعد یا تین سالوں بعد ۔۔۔۔ اپنی زندگی میں واپس آیا جا سکتا ہے ۔۔۔۔

" اپنی زندگی " ، یہ دو چھوٹے چھوٹے لفظ اُس کی آنکھوں میں روشنی دینے لگے تھے ۔ ارملا ان چھوٹے سے لفظوں میں سما گئی ۔۔۔۔ جیسے اڑھائی قدموں سے وہ پوری زمین کی پیمائش کر رہی ہو ۔

آنکھیں جو شاید کسی سوچ سے چندھیا گئی تھیں ، مند سی گئیں ۔

—— کیوں ملزم! سو گئے؟ وکیل کی آواز آئی۔

—— نہیں تو

اس نے ہڑبڑا کر کمرے کی دیواروں کی طرف دیکھا۔ پھر بڑی دیوار پر لگی ہوئی تصویر کی جانب اس کی نگاہ لپکی تو اس نے وکیل کی طرف گردن گھما کر پوچھا ——

—— یہ تصویر کس کی ہے؟

—— اچھی طرح دیکھو اور پہچانو

—— بہت اندھیرا ہے پہچانی نہیں جاتی

—— یہی تو آج کے انسان کی مشکل ہے۔

وکیل کی کہی ہوئی بات پر وہ چونک اٹھا اور تصویر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا ——

—— یہ .... یہ میرے اس دوست کی تصویر لگتی ہے

—— اچھی طرح دیکھو

—— کیا وہ واقعی مر چکا ہے؟

—— لیکن تمہیں تو یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔

—— ہاں، مجھے تو یقین تھا کہ وہ زندہ ہے۔

—— پھر، اب کیوں یقین نہیں آتا؟

—— ہماری دنیا میں لوگ اُن کی تصویروں کو ہار پہنا کر دیواروں سے آویزاں کرتے ہیں جو مر چکے ہوتے ہیں۔ آپ نے.... وکیل صاحب!

اس کی تصویر کو ہار کیوں پہنا رکھا ہے۔
تصویر کو پھر غور سے دیکھو

وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وکیل بار بار اس سے یہ کیوں کہہ رہا ہے وہ حیران ہو کر وکیل کے چہرے کو تکنے لگا۔ پھر اُس نے لکڑی کے کٹہرے کی طرف دیکھا اور اپنی طرف۔

اپنی چیخ اپنے ہی کانوں میں پڑی "میں یہاں ملزموں کے کٹہرے میں کیوں کھڑا ہوں؟"

اور کٹہرے میں سے نکل کر وہ باہر کی طرف دوڑنے لگا تو وکیل نے اس کے پاس آکر اُس کا بازو تھام لیا۔

اس نے کھولتی آنکھوں سے وکیل کی طرف دیکھا، اس وقت وہ بالکل اس کے پاس کھڑا تھا اور اس کا چہرہ عین اس کے سامنے تھا۔

دوڑتے ہوئے پاؤں جیسے بے جان ہو گئے تھے، ہونٹوں میں سے تڑپ کر نکلا "یہ میں، میں آج کالا کوٹ پہن کر یہاں کس طرح آ گیا؟"

عقبی دیوار کی طرف سے دھیمی سی ہنسی کی آواز آئی تو اس نے گھبرا کر ادھر دیکھا، جہاں ایک اونچی کرسی پر سفید چوغے والا جج بیٹھا تھا۔

وہ گھٹنے ہوئے قدموں سے چلتا، اُدھر اس میز کی طرف گیا اور کرسی پر بیٹھے جج کو غور سے دیکھا ——— جیسے پاگل ہو گیا ہو ——— یہ بھی ہیں؟ ——

میں آج سفید چوغہ پہن کر یہاں جج کی کرسی پر کیوں بیٹھا ہوا ہوں؟

اس نے کانپ کر اوپر دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویر کو دیکھا ———

"یہ میرا دوست"، "نہیں، یہ میں ہوں"، بدن پر میرا اپنا سوٹ ... اس نے کبھی بھی ایسے کپڑے نہیں پہنے تھے ..... نہیں، وہ نہیں، یہ میں ہوں ....

اس نے گھبرا کر دیواروں کو ہاتھوں سے چھوا۔

عدالت کی دیواریں جیسے اس کے جسم کا گوشت تھیں، اس کی ہڈیاں اور گھٹنے .... اس نے ہاتھوں سے چھو کر دیکھا تو لگا اس کا سارا جسم درد کر رہا ہے۔

آنکھیں ہڑبڑا کر کھلیں ....

اس نے پلنگ کے بازو کو اور سرہانے کو ٹٹولا —— بستر میں سے اٹھنے لگا تو اٹھا نہ گیا۔

رات والے خواب کی وہ درخواست یاد آئی جو اس نے اپنے گمشدہ 'میں' کو تلاش کرنے کے لئے دائر کی تھی۔

میرا وہ 'میں' سچ مچ زندہ ہے ـــ صرف کھو گیا ہے .... وہ 'میں' مر سکتا .... نہیں ....

تو رات سپنے میں اس کے اندرونی ملزم نے اُس کے باطنی وکیل سے جو کچھ کہا تھا وہ یاد آیا —— اگر وہ مر گیا ہوتا تو مجھے کسی غلط چیز میں سے باس نہ آتی .... اور مجھے کسی اچھی چیز میں سے خوشبو بھی نہ آتی ....

رات سچ مچ میں نے ایک سچ تلاش کر لیا ....

اُس نے پھر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہ گیا..

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، اس نے وقت معلوم کرنے کی کوشش

کی لیکن اس کی خواب گاہ میں بالکل اندھیرا تھا.....

اچانک اسے اپنے بستر میں سے خوشبو اٹھتی محسوس ہوئی...

وہ متحیر ہوا ـــــ اس سے پہلے ہمیشہ اسے اپنے بستر سے ناگوار سی باس آیا کرتی تھی۔

من میں آسمان کی بجلی کی طرح کچھ چمک گیا۔ شاید رات کو جب میں سو رہا تھا، میرا دوست میرے کمرے میں آیا تھا، مجھے سوئے ہوئے کو دیکھنے کے لئے..... اسی لئے میرے پلنگ سے خوشبو آ رہی ہے۔

اُس نے سکھ کا ٹھنڈا سانس لیا، ایک گونہ اطمینان کا، کہ اس کا جو "میں" اس کا دوست تھا، وہ خواہ گم ہو گیا ہے لیکن مرا نہیں.....

پھر اچانک وہ تصویر یاد آئی جو دیوار پر لگی تھی اور جس کے گلے میں پھولوں کا ہار تھا۔

تو اُس کے من سے ایک ہوک اٹھی ـــ "ہاں میری تصویر تھی ـــ مجھے قتل ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔

اور اس نے چادر کے کنارے سے بدن پر امڈے ہوئے پسینے کو اس طرح پونچھا جیسے قتل شدہ وجود سے لہو پونچھ رہا ہو۔

○

[مرے قتل کے بعد]

دوسری منزل

چپ کی لکیر پر پاؤں رکھ کر آج پھر دلیپ رائے کے گھر سے مکتا کے لئے شادی کا پیغام آیا تھا....

تین مہینے پہلے بھی آیا تھا...

یہ پیغام جیسے کوئی مرئی شے ہو اور رات کے اندھیرے میں یہ چیز گھر کے دروازے سے جیسے اندر آ گئی ہو یا سب کی آنکھ بچا کر کھڑکی کے راستے، لیکن اس رات مکتا کو یوں لگا جیسے اُس کی چارپائی کے بازو کو تھام کر وہ آہستہ سے چارپائی پر آ گیا ہو اور مکتا کا بازو تھام کر مکتا کے ساتھ چارپائی پر سو یا رہا ہو.... نیند میں کروٹ بدلتے ہوئے بھی مکتا کو محسوس ہوتا رہا جیسے وہ اب اس کی دائیں جانب تھا اور اب بائیں جانب کو سرک گیا.... جس طرف بھی اس نے کروٹ لی.....

بہت ملائم، متحرک اور زندہ چیز

اُس صبح کو مکتا معمول کے مطابق مطمئن نیند سے نہیں جاگی، آنکھ کھلی

تو اس کا اپنا ہاتھ پہلو کی سمت کو ٹٹول رہا تھا.... اور پھر وہ ہڑبڑا کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اٹھ کر بھی خالی چارپائی کو تکے جا رہی تھی — جیسے وہ چیز اگر اس وقت چارپائی پر نہیں تھی، تو کہاں تھی۔

پریشان من کو وہ آئینے کے آگے کھول کر دیکھنے لگی لیکن وہیں کھڑی کھڑی آئینے میں ملفوف ہو کر رہ گئی۔

اور آئینے میں ملفوف اس کے ہونٹ تین مہینوں سے خاموش تھے۔ یہ خاموشی کی ایک لکیر تھی —— جو موتیا خان کی گھنی اور تنگ آبادی کی ایک گمنام سی گلی میں رہتی مکتا کے گھر سے لے کر دلی کے ایک خوبصورت ٹکڑے پنچشیل پارک کے، دلیپ رائے کے گھر تک کھنچی تھی۔

اور اس چپ کی لکیر پر پاؤں رکھ کر آج پھر مکتا کے لئے دلیپ رائے کے گھر سے شادی کا پیغام آیا تھا۔

نچلے متوسط گھروں کی ایک مخصوص خوشبو ہوتی ہے چارپائیوں کے نیچے بھرے ہوئے ٹرنکوں اور ٹین کے ڈبوں کی طرح ہر وقت گھر میں چھپ کے بیٹھی ہوئی سی، اور کھونٹیوں پر لٹکے میلے کپڑوں اور رام کرشن یا ہنومان کے کیلنڈروں کی طرح گھر کی دیواروں کو ڈھانپ کر بے جھجک ایستادہ خوشبو...

مکتا جانتی تھی کہ اس نے جب بھی اس گھر کی باس میں سے ابھرنا چاہا تھا تو یہ باس بہت تیز ہو گئی تھی — اتنی گاڑھی کہ مکتا کو اس کے اندر سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے کالج میں تعلیم پائی تھی۔

لیکن وہ تعلیم بھی اسے اس باس سے نجات نہ دلا سکی تھی۔ وہ صرف وقت سے ذرا سا آگے سرکتی اپنے ماں باپ کی سوچ تھی، ایک مجبوری سی کہ تعلیم کا ایک آدھ ٹکڑا، اُس طبقے کے لوگوں میں بھی، لڑکیوں کے جہیز کا ایک ضروری حصہ بن گیا ہے۔

اور پچھلے برس ——— مکتا نے ایک شعوری کوشش کی تھی۔ جب شہر کی سب سے خوبصورت لڑکی کا انتخاب ہوا تھا، تو اس نے اپنا نام درخواست کے کاغذ پر درج کیا تھا اور پھر اپنے قد اور اپنی کمر کو، ناپتی، جب باقی تفصیل کو کاغذ پر درج کر رہی تھی....

قد پانچ فٹ چھ انچ، کمر بائیس انچ، تو گھر کی باس ایک آندھی کی طرح پورے گھر میں برپا ہو گئی تھی، اور درخواست پر لکھا ہوا مکتا کا نام اپنی لکیروں میں ہی کانپ کر رہ گیا تھا....

گھر کی سب چیزیں، جب سے وہ دیکھ رہی تھی، بدستور تھیں ——— گھر کی رینٹیں تھیں جو اس کے .... باپ نے چنوائی تھیں، ماں کے کمرے میں چھوٹے چھوٹے شیشوں والا پلنگ بھی، جو ماں کی ساس نے جہیز میں دیا تھا اور کچن کی ٹیڑھی میڑھی گاگر اور وہ ٹپکتی ہوئی گڑوی بھی، جس پر گھر کے ایک بزرگ کا نام کھدا ہوا تھا ——— چندا سنگھ۔

اور مکتا جانتی تھی کہ اس کی ماں کا، بیٹی کے ہاتھ جلدی پیلے کرنے والا خواب بھی اٹل ہے جو اسے اپنی ماں سے وراثت میں ملا تھا۔

صرف چیزیں ہی نہیں، گھر کی وہ گنتی بھی موجود تھی، جو گھر کی ہر بیٹی کے

گھر سے رخصت ہوتے وقت، اور ہر بہو کے گھر آنے کے لمحے، پوری ہوتی ہے۔ جہیز کے پانچ زیور اور گیارہ سوٹ، لڑکے کی انگوٹھی اور گھڑی، سمدھن کا ریشمی سوٹ اور سونے کی مالا، سمدھی کا گرم دوشالا اور اکیاون لڑپے اکیس روپے بڑے بھائی کے، گیارہ، چھوٹے کے ....

انگلیوں پر بیٹھ کر حساب لگاتی ماں کے منہ سے یہ گنتی مکتا نے اتنی بار سنی تھی کہ یہ گنتی بھی ایک ساکت چیز کی طرح اُسے گھر میں پڑی ہوئی جنتری نظر آنے لگی تھی

خالی جنتری ہی نہیں۔ مکتا کو لگتا، یہ گھر کی ہر لڑکی کی جنم پتری ہے۔ اور وہ سوچتی ..... یہ ایک عمری زائچہ ہے، جو ایک نسل سے رینگتا رینگتا دوسری نسل تک پہنچ جاتا ہے، اور ہمیشہ ساکت و جامد نظر آتا ہے۔

مکتا کو یقین ہے کہ یہ جمود یونہی طاری رہے گا لیکن اچانک جو اس گھر کے خوابوں سے منفک تھا وہ لاینفک بن گیا اور یہ جمود کہیں اپنے باطن میں لرز کر رہ گیا اور آج تک لرز رہا ہے جیسے زلزلے کے بہت بڑے جھٹکے کے بعد کئی بار چھوٹے چھوٹے جھٹکے آتے رہتے ہیں۔

اس کا پہلا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ مکتا کے پتا جی کتنی دیر تک اپنے سنسناتے ہوئے کانوں کو ٹٹول کر محسوس کر رہے تھے، انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ انھوں نے یہ پیغام اپنے کانوں سے سنا ہوگا۔

مکتا کے پتا جی شہر کے اس دیرینہ وکیل کے منشی تھے جس کا سب سے امیر موکل دلیپ رائے کا باپ ہوا کرتا تھا، جس کی بہت جاگیر تھی۔

اور جس کے معاملات کو سنبھالنے کے لئے وکیل کی ایک تنخواہ مقرر تھی۔ اس کے علاوہ جب دلیپ رائے کے والد نے برآمدات کا کاروبار شروع کیا تھا تو زرمبادلہ کے لین دین کو طے کرنے کے لئے اُن کا وکیل ریزرو بینک کی بمبئی شاخ میں جایا کرتا تھا، اور اس کے لئے ہر بار ہوائی جہاز کا ٹکٹ لاتے ہوئے اس کے منشی کی آنکھوں کے آگے اس کے موکل کا تمول ایک استعجاب کی طرح لہرایا کرتا تھا اور اب جبکہ اُس گھر سے اپنی بیٹی کے لئے شادی کا پیغام آیا تو اس کی عقل چکرا گئی۔

موتیا خان کے علاقے کی ایک گمنام سی گلی کے اس گھر میں سچ مچ ایک زلزلہ سا آگیا۔ پیغام آیا تو مکتا کی ماں اینٹوں کی درزوں والے فرش سے ایک بار تو قریب قریب کھسل سی گئی۔ جیسے وہ سفید سیمنٹ کا ٹاٹری سے تازہ تازہ دھویا اور ویکس سے پالش کیا ہوا فرش ہو۔

یہ زلزلہ مکتا کے من میں بھی آیا لیکن اس طرح نہیں، جیسے ماں یا باپ کے من میں آیا تھا۔

ابھی پورا نہیں ہوا تھا ـــــ جب مکتا نے دلیپ رائے کا گھر دیکھا تھا۔ اس کا سبب یوں پیدا ہوا کہ دلیپ رائے کی رشتے کی ایک بہن کُسم، مکتا کے کالج میں اپنی کسی پرانی سہیلی سے ملنے آتی تھی تو مشترکہ واقف کار لڑکی نے اسے مکتا سے ملوایا تھا، اسی دن گھنٹہ بھر کے لئے وہ تینوں دلیپ رائے کے گھر گئی تھیں۔

املتاس کے پیلے گچھوں اور گل مہر کے لال پھولوں میں گھرے ہوئے

کا ایک جلوہ سا آج مکتا نے اپنے ذہن میں تازہ کیا تو من میں جیسے ایک خوشبو سی بھڑک اٹھی۔ لیکن یوں جیسے یہ خوشبو اس کے لئے ممنوعہ ہو۔

اس نے اس روز دلیپ رائے کو بھی دیکھا، اس کی پتنی کو بھی اور اس کے کئی سال کے بیٹے کو بھی۔

وہ سب کچھ بہت خوب صورت تھا لیکن جب تک دور تھا تو بیگانہ تھا، سہج تھا ـــــ لیکن اب جبکہ وہ سب کچھ سرک کر اس کے قریب آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں تک، اس کے بدن سے گزر کر اُس کے من تک، تو کچھ بھی سہج نہیں رہا تھا۔

وہ جو مکمل تھا ـــــ سالم، اُس میں سے موت نے ایک ٹکڑا توڑ لیا تھا۔ دلیپ رائے کو بیوی کی اب وہی خالی جگہ پُر کرنا تھی ـــــ مکتا کے ساتھ۔

شادی کا یہ پیغام، مکتا کو لگ رہا تھا جیسے ایک خالی جگہ پُر کرنے کا پیغام ہو۔

ایک مرد کے من کا نہیں، صرف گھر میں خالی ہوئی ایک جگہ کا....

اس گھر سے ایک عورت آئی تھی، دلیپ رائے کی ماں نہیں کوئی اور عورت کہہ رہی تھی۔ وہ تو شادی کی بات نہیں سنتا تھا جیسے بیراگ ہی دھار لیا، بہت مشکل سے ماں نے راضی کیا ہے۔

تو یہ، مکتا کو لگا، مرد کے من کا نہیں، ایک گھر میں خالی ہونے والی ایک جگہ کا پیغام ہے

ایک گڑھے کو پُر کرنے کی طرح

ایک شگاف کو پاٹنے کی مثال
ایک دراڑ کو لیپ کر برابر کرنے کے مانند

لیکن میں کیوں ... میری جگہ کوئی بھی ہو سکتی تھی، کوئی بھی اور مکتا کو خیال آیا ——— وہ جدھر نظر ڈالتا، کچھ بھی اُس کے لئے حاضر تھا کچھ بھی اس کی پہنچ سے باہر نہیں ——— پھر صرف میں کیوں۔

اور مکتا کے من میں ایک گرم سی لکیر کھنچ گئی۔ اُس نے ایک بار مجھے دیکھا تھا۔ شاید وہی ایک لمحہ اُس کے من میں اٹک گیا ہو — شاید...

اور شاید کی اس خام سی امید کو ہاتھ ڈاس مکتا اس جگہ دیکھنے لگ گئی جہاں آج اندھیرا تھا۔ ، اور جہاں سے آج کوئی پہچان کی کرن طلوع نہیں ہوئی تھی۔

کالج کی سہیلی ایک شعاع کی طرح آئی اور دیر تک ہنستی رہی " سو تم شہر کی سب سے خوب صورت لڑکی کے طور پر منتخب ہوئی ہو۔ اس وقت مکتا کا ہاتھ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرایا، شاید کسی آسرے کے ساتھ اک حوصلے کے ساتھ، پوچھنا چاہا ——— میرا خیال کیسے آیا ہوگا، ماں کو یا خود اس کو... یا صرف اس کو جو رشتے میں اس کی بہن لگتی ہے"

لیکن مکتا سے پوچھا نہ گیا۔ ہاتھ اندھیرے میں بے حس سا ہو کر رہ گیا اور پھر اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔

وہی عورت ایک بار پھر آئی اور مکتا کی ماں کے پاس بیٹھ کر مکتا کی تقدیر پر رشک کرتے ہوئے کہنے لگی " ایک تو اس کے نصیب جاگیں گے اور دوسرا

اس بلکتے سسکتے بچے کے، جس کی ماں، خدا نے چھین لی ہے، اور جب ماں کا لفظ مکتا کے کنوارے انگوں سے ٹکرایا تو اس کے سارے اعضا گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگے ....

یوں لگا ——— اس کے پاؤں تلے اس کی اپنی زمین نہیں ہے .... کبھی نہیں ہوگی اسے ہمیشہ اسی زمین پر چلنا ہوگا جو کسی اور کے پاؤں کے لئے تھی ....

بیوی کوئی اور تھی، اس نے صرف اس کی جگہ پر بیٹھنا ہے ....

ماں کوئی اور تھی، اس نے صرف اس کا کردار ادا کرنا ہے۔

اندھیرا شاید بہت گہرا ہو کر ٹھوس دیوار کی طرح ہو گیا تھا۔ اس نے سر کو دیوار سے ٹکرایا تو سوچیں بھی بدن کی طرح نڈھال سی ہو گئیں۔ کسی کی جگہ پر کھڑی ہوئی ہیں، جب نظر آؤں گی۔ ایک اجنبی، تو وہ بچہ زور سے رو پڑے گا .... اس کا باپ بھی .... شاید زور سے نہیں، آہستہ من ہی من میں۔

تو مکتا کو لگنے لگا، " وہ ایک قبر پر بیٹھے ہوئے قبر کے پریت جیسی ہو جائے گی۔

شادی کے پیغام کی ہاں کرنی تھی۔ لیکن مکتا سے ہاں نہ ہو سکی۔ ہونٹ سل گئے، باپ کے حکم کے آگے بھی، ماں کی منتوں کے آگے بھی ....

اور مکتا کے ہونٹوں پر جمی ہوئی چپ ایک لکیر بن کر وہاں تک پھیل گئی جہاں سے شادی کا سندیسہ آیا تھا۔

تین مہینے گزر گئے ....

لکیر خاموشی کی لکیر پہ پاؤں رکھ کر آج پھر وہ پیغام آیا، شاید مکتا کی

سوچوں کو ہاتھ ڈالتا اور کہتا، "بچہ دادی کے پاس رہے گا، پنجاب میں
یہاں دہلی میں نہیں ..."

ماں نے مکتا پر زور ڈال کر اس کی خاموشی کو توڑ دینا چاہا، خاموشی
کا بدن چھل گیا، وہ ماں کی باتوں سے زخمی ہو گئی لیکن ٹوٹی نہیں...

مکتا کی اپنی سوچوں میں —— اس کی زبان کاٹ لی گئی تھی۔
بولا نہیں جا رہا تھا۔

لگا —— کبھی نہیں بولا جا سکے گا، ہاں کہنے کے لئے بھی نہیں ...
جانتی تھی ... دنیا میں کوئی ایسی عورت نہیں ہوتی جو اپنے وجود
کی پوری طاقت سے ایک مرد کو آواز نہیں دینا چاہتی۔

"میں بھی چاہتی ہوں"

وہ سوچتی، لیکن دیکھتی —— آواز اندر کہیں، حلق سے بھی نیچے،
اٹک کر کھڑی ہو گئی ہے۔

شاید کبھی ہونٹوں تک نہیں آ سکے گی ... وہ —— من میں دلیپ
رائے کو دیکھنے لگی، اپنا بنا کے، من کے زور کے ساتھ بھی قانون کی طاقت
کے ساتھ بھی، —————— لیکن جہاں جو کچھ بیگانہ تھا،
وہ اسی طرح رہا ... بیگانہ بھی اور ممنوعہ بھی ....

اور مکتا کو لگا —— کبھی کچھ بھی اپنا نہیں ہو گا، نہ کسی رسم کی
طاقت سے اور نہ ہی سالوں کے بل پر ...

مکتا جہاں تک دیکھتی، دور تک نظر آتا، دلیپ رائے کی جو بھی

حیثیت ہے، اگر اس نے زندگی کا پہلا انتخاب کرنا ہوتا تو یہ انتخاب مکتا کبھی نہ ہوتی، راستے میں بہت کچھ آکر راہ کی دیوار بن جانا تھا۔

موتیا خان کی تنگ گلی ـــــ ایک بے توقیری، سر جھکا کر کھڑا ہوا مکان منشی باپ کی، اُس کی ہڈیوں کی طرح گچھا بنی حیثیت ... اور... اور

مکتا کے لئے یہ اور، بہت ادھر تھا۔ اور دلیپ رائے کا وجود بہت اُدھر...

کئی "اور" اس کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور مکتا کو لگا، جیسے وہ اور کچھ نہیں، صرف کسی کی قبر پر ڈالی جانے والی مٹی کی آخری مٹھی ہو۔

آخری مٹی ـــــ ایک قبر کی لاش کو ڈھانپنے کا آخری حربہ ہوتا ہے، مکتا نے ایک فلسفی کی طرح سوچا لیکن ساتھ ہی اُسے لگا ـــــ جیسے مٹی میں رینگتا ایک کیڑا، اس کے جسم پر چڑھ رہا ہو... اس کی ننگی جلد کو ٹٹولتا، سونگھتا اور اُسی کے لہو میں سے ایک بوند چاٹ کر اس کے گوشت پوست سے کھیلتا۔

مکتا نے چونک کر اپنے آپ کو دیکھا، اوہ خدایا! کیا میرے من نے مجھ سے چوری چوری، اس سے اتنی محبت کر لی ہے ـــــ کیا ان برسوں کو برداشت نہیں کر پا رہی، جب وہ میرا نہیں تھا کسی اور کا تھا کسی اور کا مرد، کسی اور کے بچے کا باپ۔

اور مکتا نے اپنا ہونٹ دانتوں تلے کاٹ لیا، او، رب! کیا ایک مرچکی عورت کا وجود بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔

تو اسے لگا جیسے ان سارے مہینوں کی چپ اور کچھ نہیں تھی، صرف ایک گلا تھا، اس کے ساتھ، جو اس کا تھا، صرف اس کا، اور جس نے اس سے ملنے سے پہلے اُس سے وفا شکنی کی تھی۔

من ایک لمبی گپھا بن گیا اور جس میں سے گزرتی مکتا کو، شادی کا پیغام بھیجنے والا دلیپ کبھی اتنا اپنا لگتا رہا جیسے ہونٹوں کے سانسوں سے بھی قریب ہو اور کبھی اتنا پرایا کہ آنکھوں کی پہچان سے بھی دور۔

آج پھر ایک رات آئی جب یہ پیغام پھر ایک جیتی جاگتی چیز بن کر اسے کمرے میں داخل ہوتا محسوس ہوا، اور پھر اس کی چارپائی کے اوپر آکر بیٹھ گیا، اس کے بازو سے لپٹ کر اس کے ساتھ سویا رہا، بہت، متحرک اور کہیں کہیں سانس لیتا ہوا۔

صبح ہوئے آنکھیں کھلتے ہی مکتا کو لگا۔ بہت دنوں کے بعد آج کا دن پُرسکون ہے۔ شاید اس نے دلیپ رائے کے بیتے ہوئے دنوں کو قبول کر لیا ہے اور اس کے بچے کو بھی

بچہ دادی کے پاس رہے گا، پنجاب میں، یہاں دہلی میں نہیں ....

مکتا چارپائی سے اٹھ کر اندر اپنے کمرے میں جانے لگی تو یہ الفاظ اُس کے پاؤں میں چبھ گئے، یوں لگتا تھا شاید کل سے وہیں باہر آنگن میں پڑے ہوئے تھے۔

لگا —— جیسے پاؤں سے لہو پھوٹ بہا ہو۔

حیرت بھی ہوئی کہ ایک سے الفاظ ایک لمحے بالکل نئے معانی کیسے

پہن لیتے ہیں؟ ——— یہی الفاظ تھے، کل سنے تھے تو من کو کچھ سکھ دیتے محسوس ہوئے تھے، خواہ مخواہ کے لفظ "ماں" سے اس کو سرخرو کرتے اور دلیپ رائے کے بیتے دنوں کی گواہی کو ہر وقت دیکھتے رہنے کی مجبوری سے رہائی دلاتے.... .... کل اور آج کے بیچ کچھ وقوع پذیر نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی آج یہ الفاظ شیشے کی کرچیوں کی طرح، کسی اور کو نہیں خود اس کے اپنے ماس کو خراشنے لگ گئے تھے۔

ماں منافقت پر اتری ہوئی ہے.... شاید سارے متوسط طبقے کا مذہب ہی منافقت ہے۔ مکتا کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ اسے یاد آ رہا تھا۔ کل ماں نے یہ لفظ سنے تو ہائے ہائے کر اٹھی جیسے بچے کو گھر سے دور بھجوا کر اس پر کوئی ظلم توڑا جا رہا ہو لیکن وہ عورت چلی گئی تو اُن ہی سانسوں کے ساتھ ماں نے ایک سکھ کا سانس لیا کہنے لگی "چل یہ بھی اچھا ہو.... سوتیلے بچے پالنا کوئی آسان کام ہے۔ جی کا زیاں ہوتے ہیں۔"

اور مکتا کو اپنے اوپر ایک گونہ اطمینان ہوا کہ میں کچھ بھی ہوں مگر ماں جیسی نہیں ——— جو کچھ من میں ہے، وہی ہونٹوں پر رکھ کر دیکھ رہی ہوں۔ میرا کل کا چین بھی سچ تھا اور آج کی بے چینی بھی سچ ہے....

ہاں اور نہ جیسے سچ مچ کے علاقے ہوں، شاید ایک دوسرے کے دشمن علاقے اور مکتا دونوں کی سرحدوں کے بیچ بے نام علاقے میں کھڑی ہو۔

معلوم تھا —— اس جگہ پر بہت دیر تک کھڑا نہیں رہا جا سکتا لیکن پاؤں کسی جانب اٹھتے نہیں تھے۔

یہ ہاں یا نہ کہہ سکنے والی آزادی کی مجبوری تھی ....

اور اس جگہ پر کھڑی مکتا کو ایک بار ماں پر رشک آنے لگا، جس کی آنکھوں کے آگے تمول کی چکا چوند اتنی تیز ہے کہ وہی اس کے لئے سب سے بڑی سچائی ہے۔ اور اس کے سوا جو کچھ بھی اندھیرے میں ہے وہ سچ نہیں۔

یہ سچ صرف منفرجہ سوچ کی غلامی کا سکھ ہوتا ہے، جہاں سب کچھ اکہرا ہوتا ہے، رشتے کا مفہوم بھی اکہرا اور انسانی وجود کے معنی بھی اکہرے، اور یہ سوچتی ہوئی مکتا کو لگا —— کچھ بھی ہو لیکن ماں پر رشک کرنے کا سکھ مجھے نہیں چاہئے میری پہچان تو میرا درد ہے۔

یہ بھی لگا کہ —— کسی کے ساتھ کوئی رشتہ جب بیرونی چیزوں کے سہارے کھڑا ہوتا ہے —— جیسے مذہب کی ٹیک لگا کر، یا دولت کے آسرے پر یا بنے بنائے اور کاٹے پیٹے قانون کے بل پر تو اسے کبھی دل کے درد کی سوغات میسر نہیں آتی، صرف غلامی کا سکھ ملتا ہے لیکن آزادی کی کسک نہیں ملتی۔ وہ تو صرف اس وقت ہاتھ آتی ہے جب وہ رشتہ دلوں کا ہو... اور کسی بھی آسرے کے بغیر کھڑا ہونا چاہتا ہو —— صرف اپنے وجود پر....

اور اپنے وجود کے درد کو پہچانتی مکتا، ابھی بھی راہ کو پہچان نہیں پا رہی تھی کہ ایک بھیانک حادثہ ہو گیا۔ دلیپ رائے کا بیٹا ایک ہی دن میں خناق سے چل بسا۔

موت کے بھیانک وار نے مکتا کی خاموشی کو توڑ دیا اور اس نے تڑپ کر ہاں کر دی، جیسے ایک ہارے ہوئے علاقے کو اس وقت اس کی بہت ضرورت ہو

(۲)

شادی کا پیغام، سر جھکا کر سوگ کے سورج کی کرنوں میں سے گزرتا رہا، جب سوگ کی کتاب کے اوراق کچھ باسی ہو چکے تو اس کے دل میں چاہت سی جاگی ——— کچھ رسمیں نبھانے کی لیکن نہایت سادگی سے، کوئی ہنگامہ برپا نہ ہو۔

سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق ہوا۔ صرف مکتا کی ماں نے، کچھ ایسے شگون جنہیں چار دیواری کے حلقے میں نبھایا جا سکتا تھا، نہایت خاموشی سے پورے کر دیئے اور جب مکتا ہون کی آگ کے پاس سے اٹھ کر صبح کے پہلے پہر دلیپ رائے کی معیت میں اس کے گھر آئی تو کچھ تھوڑی سی رسمیں، جو شور و شغب سے عاری ہو کر نبھائی جا سکتی تھیں، دلیپ کی ماں نے ادا کر دیں۔

ایک چھوٹا سا شگون تھا، جو مکتا کی رشتے میں جیٹھانی نے اپنے ایک سال کے بھائی کو مکتا کی گود میں بٹھا کر انجام دیا جس کے ساتھ ہی کچھ عورتیں اس روایتی گیت کو گانے لگیں جو ایسے موقع پر محبت کو دو بالا کرنے کی امید

پر گایا جاتا ہے۔

مکتا کی پیشانی پر گھونگٹ کچھ نیچا تھا، لیکن روایتی گھونگٹ جیسا نہیں، اس نے سر جھکا کر گود میں بیٹھے بچے کو دیکھا اور آنکھیں ایک خوف سے پھیل سی گئیں.. یوں لگا — کسی نے اچانک، ایک مردہ بچہ اس کی آغوش میں بھر دیا ہو۔ گود میں آیا بچہ ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا تھا —— لیکن بہت مطمئن، نئے ہاتھ کے لمس سے کبھی نا آشنائی کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ شاید مکتا کی بانہوں میں گنگناتی ہاتھی دانت کی سرخ چوڑیوں کو نئے نویلے کھلونوں کی طرح دیکھ رہا تھا دو تین عورتیں وہ گیت گا رہی تھیں لیکن بڑی بھری ہوئی آواز میں گیت کے سارے بول اڑتے ہوئے پروں کے ساتھ ہوا میں جھول رہے تھے دلیپ رائے کی ماں، شگونوں کے اس موقع پر کوئی بے شگونی نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے آنکھوں کے ساگر آنکھوں کی جانب ہی موڑ دیئے — لیکن اس وقت پچھلے دنوں ہوئی بچے کی موت، پھر جیسے تازہ ہو کر، سب کی آنکھوں کے آگے تیر گئی۔

ایک حسرت بھی کہ آج کے دن اس بچے کو مکتا کی آغوش میں دینا تھا مکتا نے، باقی سب کی طرح اس بچے کی موت نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت سب سے زیادہ المیاتی خوف اسی پر طاری تھا — جیسے وہی مرا ہوا بالک اس وقت اس کی گود میں.. ...

اور یوں لگا —— یہ لاش ہے جو شاید ہمیشہ اس کی گود میں پڑی رہے گی۔

رات بھر کی تھکن تھی، بے نیند رات کی تھکن، دلیپ رائے چائے کا ایک کپ پی کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور بڑے کمرے میں صرف مکتا تھی یا شادی کے اس موقع پر مہمان بن کر آئی ہوئی کچھ عورتیں، مکتا سے کچھ شگونوں کا مذاق کرتیں، جب اس کی گود میں بھرے بچے کو علیٰحدہ کر دیا گیا تو مکتا نے کچھ تھکی تھکی سی آنکھوں سے کسم کو دیکھا۔ صرف کسم تھی جسے اس گھر میں مکتا کچھ کچھ پہچانتی تھی۔ اُسی نے آج رشتے کی سب سے پہلی آواز کے ساتھ اُسے مخاطب کیا تھا۔ بھابی کہہ کر۔

کسم نے —— گھر کی ماں کی طرف دیکھا، کہا: چچی! بھابی ساری رات کی جاگی ہوئی ہوں گی۔ ماں نے مکتا کو بڑے کمرے کے صوفے سے اٹھاتے ہوئے کسم سے کہا —— دلیپ کے برابر والا کمرہ خالی ہے، جا بھابی کو وہاں لے جا، گھڑی بھر کے لئے آرام کر لے گی۔

کسم پل بھر کے لئے شاید کسی سوچ میں اتر گئی "بھابی! ایک منٹ، میں کمرہ درست کر لوں۔"

باقی کمروں میں آج کے مہمان تھے کسم نے جا کر دیکھا —— صرف وہی ایک کمرہ تھا، جس میں کسی مہمان کا قیام نہیں تھا۔ کسم کمرے میں چلی گئی اور الٹے قدموں لوٹ کر مکتا کو اس کمرے میں لے گئی۔

کسم نے کمرے میں کچھ پھل رکھوائے —— چائے رکھوائی اور پھر کمرے کا دروازہ بند کر کے جیسے چلی گئی تو کمرے میں رہ گئی تنہا مکتا، کھڑکی میں سے پائیں باغ کی سمت دیکھنے لگی۔

ملحق کمرے میں دلیپ رائے تھے۔ بہت نزدیک، لیکن پوری ایک دیوار کے فاصلے پر... کسم نے ہی اس کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے بتایا تھا، "آپ کا اپنا کمرہ یہ ہے"، اور ہنستے ہنستے کسم نے مکتا کے کان سے ہونٹ لگا کر کہا تھا "لیکن اصل کمرا تو رات کو بنے گا"

کمرہ باغ سے جڑا ہوا ہونے کے سبب بہت تازہ ہوا سے معمور تھا۔ ہوا میں ہلکی سی مہک تھی۔ مکتا نے برابر کے کمرے میں خوابیدہ دلیپ کے احساس کو سانسوں میں شمار کرنا چاہا لیکن لگا —— وہ احساس ابھی تک اجنبیت کے خول میں بند ہے، سانسوں میں محسوس نہیں ہو رہا۔ شاید باغیچے کی تازہ ہوا سے بھی زیادہ اجنبی....

اور مکتا تھکی ہوئی سی کمرے کے پلنگ پر بیٹھنے لگی تھی کہ اچانک خیال آیا۔

مکتا لمحہ بھر کے لئے اس کمرے میں آئی تھی، ماں نے کہا تھا، کمرہ تیار ہے مگر وہ پھر بھی اکیلی آئی تھی....

اور مکتا نے کمرے کی چاروں دیواروں کی طرف دیکھا، اٹھ کے کمرے کی الماری کھولی... الماری خالی تھی —— صرف ایک تصویر تھی شیشے کے فریم میں جڑی ہوئی —— جو ایک خانے میں الٹی پڑی ہوئی تھی۔

یوں لگا.... جو خیال آیا تھا، ٹھیک تھا۔ مکتا کو ضرور علم ہوگا کہ یہ کمرہ اس بچے کا تھا...

کسم کے من کی یہ ملائم سی جگہ، جیسے مکتا کے ہاتھوں کو چھو گئی.....

اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ وہ تصویر اٹھائی ... دیکھا، بچے کی تصویر تھی اور لگا کہ یہ ضرور دیوار پر آویزاں رہی ہوگی .... جو ابھی کچھ دیر پہلے کسم نے اتار کر الماری میں رکھی تھی۔

مکتا نے پھر کمرے کی دیواروں کو دیکھا تو وہاں ایک طرف لکڑی کی ایک ابھری ہوئی پٹی تھی جس پر جڑا ہوا ایک کیل بہت خالی سا دکھائی دے رہا تھا۔

مکتا نے ہوک جیسا ایک سانس کھینچا اور بازو بلند کر کے وہ تصویر پھر اس میخ کے ساتھ آویزاں کر دی ...

کھڑکی کی طرف سے آتی ہوا میں نئی کونپلوں کی مہک تھی لیکن اچانک مکتا کو احساس ہوا جیسے بہت دنوں سے جھڑے ہوئے اور گلتے سڑتے پتوں کی باس بھی ہوا میں رچی ہو۔

پلنگ پر لوٹتی مکتا نے تھک کر آنکھیں موند لیں ....

لیکن نیند کے خمار میں، مکتا کو محسوس ہوا کہ کچھ آوازیں ہیں، جو معلوم نہیں کہاں سے آ کر اس کے کانوں میں اتر رہی ہیں۔

یہ لڑکی تو پہلی کو بھی مات کرتی ہے۔ لیکن قدم مبارک ہوں .... اِدھر بات چلی اُدھر لڑکا چلا گیا ...

مکتا ہڑبڑا کر جاگ گئی ... گھبرا کے دیواروں کی طرف دیکھا، پھر کھڑکی کی طرف .... باہر کے درختوں کی طرف جہاں گھر میں مہمان آئے لوگ اس وقت باغیچے میں بیٹھے تھے ...

یوں لگا ـــــ یہ سب کچھ جو ہوا میں ہے، ہوا ہی میں محفوظ رہے گا...
شاید یہاں، اس مٹی میں اُگ کر ان درختوں کے مانند پھیل جائے گا۔
جو باتیں بھی ہوا میں تھیں، مکتا نے پتوں کی شائیں شائیں کی طرح سنیں۔
لیکن کوئی بھی اداسی کانوں کو اتنی اجنبی نہیں لگ رہی تھیں، جیسے یہ آوازیں اس نے پہلے بھی سن رکھی ہوں ـــ اپنے اندر۔
گھر میں موت کی باس پھیلی ہوئی تھی، لیکن وہ پوری طرح حواس میں تھی، مکتا کو لگا ـــــ جو اس سے بھی سوا ہے، وہ کچھ اور ہے، شاید گھر میں نہیں، اس کے اپنے من میں ہے۔
اک خوف سا محسوس ہوا ـــــ صرف میں نہیں، شاید دلیپ رائے بھی اس باس کو جانتے ہیں..... اور شاید ایک دن مجھ سے بہت نفرت کرنے لگیں گے۔

(۳)

رات اٹھی....
یہ اکتوبر کا مہینہ تھا، کھلے موسم کا، لیکن رات سردی کی کپکپی لے کر آئی...
کپکپی شاید موسم کی نہیں، مکتا کے من کے خوف کی تھی، لیکن وہ گردن کی شریانوں تک پھیل رہی تھی۔

باہر ایک اطمینان اور سکھ کا احساس تھا۔ کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے آگے مخمل کے پردے تھے جن کا رنگ دیواروں کے رنگ کی طرح بھرپور تھا اتنا کہ ان کا وجود بھی دیواروں کا ایک حصہ محسوس ہوتا تھا....

اور فرش سے بمشکل دو بالشت بلند چوکور پلنگ تھا، روشنی صرف ایک گول فانوس کی تھی جو موٹے اور دہکتے ہوئے کوئلوں کا ہم شکل تھا —— گہرا سرخ اور بس —— کمرے میں اور کوئی چیز نہ تھی

دلیپ کی ماں جب مکتا کو اس کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی، تو مکتا نے کمرے کے گرم اطمینان کو اپنے انگ انگ میں محسوس کیا لیکن سردی کی جو کپکپاہٹ اُس کی گردن کی شریانوں میں رینگ رہی تھی —— وہ بھی اسی طرح اُس کے اعضا میں سرایت کر رہی تھی۔

دیکھا —— کمرے میں اس پلنگ کے علاوہ بیٹھنے کی اور کوئی چیز نہیں تھی.....

مکتا کھڑی رہی.....

خیال آیا —— لڑکی شادی کی رات جس کمرے میں داخل ہوتی ہے کبھی اس کمرے کا مالک اس کے خیر مقدم کے لئے وہاں موجود نہیں ہوتا...

اور ہر لڑکی ایک اجنبی کمرے میں ایک دخل اندازی کے سے انداز میں پاؤں دھرتی ہے.... اور مکتا کو استعجاب ہونے لگا —— ایک روایت ہے لیکن شاید اسے کبھی کسی نے محسوس نہیں کیا اس لئے کبھی نہیں بدلا...

کمرے کی دہکتے اخگروں جیسی سرخ روشنی، کمرے میں پھیلی ہوئی نہیں

تھی، وہ پلنگ کے پاس کوئلوں کے ڈھیر کی طرح فرش پر پڑی تھی، اس لئے مکتا کچھ دیر کمرے کے ایک گوشے میں پتھر کے اس مختصر سے تابداں کو نہ دیکھ سکی جس پر ایک تصویر پڑی تھی، لیکن اس کی آنکھیں جب کمرے کی نیم تاریکی کی عادی ہوگئیں تو اس نے کسی کتاب کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

اپنے آپ کو وہ بستر میں تنہا بہت بے چین محسوس کر رہی تھی، جو آج تک اس کا نہیں تھا اور آج تک کسی اور کا تھا.....

سوچا ـــــ کمرے میں پڑی ہوئی کتاب مل جائے تو وہ فرش پر روشنی کے قریب بیٹھ کر کتاب پڑھتے پڑھتے انتظار کی گھڑی بتالے.....

اس طرح کچھ اطمینان مل سکتا تھا، کمرے میں یوں کھڑے رہنا..... اس کے لئے اطمینان کی خوشبو نہیں جلا سکتا تھا

اس لئے وہ کسی کتاب کو تلاش کرتے ہوئے جب کمرے کا بغور جائزہ لینے لگی تو اس کی نظر کمرے میں بنے اس مختصر سے تابدان پر پڑی جس پر ایک تصویر رکھی تھی)..... پاس گئی، دیکھا تصویر بچے اور ماں کی تھی..... کمرا نہیں، کمرے میں اسے اپنا آپ بالکل اجنبی لگنے لگے.....

باہر ہوا شاید تیز ہو چلی تھی، کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں، لیکن وہ دیواروں کے ساتھ لگ کر تیز تیز سانس لیتی لگ رہی تھی.....

دروازے کے پردے نے بھی ایک گہرا سانس کھینچا اور پاؤں تک نرز گیا..... مکتا نے دیکھا ـــــ دلیپ رائے کمرے میں آئے تھے.....

مکتا شاید ـــــــ دن کے وقت دیکھی ہوئی مکتا سے بھی حسین لگ رہی تھی، دلیپ رائے اس کی طرف دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے. پھر سنبھلے، دھیمے سے مسکرائے اور پھر قریب ہو کر کہنے لگے "اس طرح کھڑی رہیں، ؟ تھک نہیں گئیں ؟"

.. بجلی کے کوندوں میں سے جیسے ایک چھوٹی سی چنگاری اٹھی ہو، مکتا نے کہنا چاہا ـــــــ کمرے نے بیٹھنے کے لئے کہا ہی نہیں تھا .... لیکن ہونٹوں نے اس کے لفظوں کا خیر مقدم کرنے سے انکار کر دیا .....

. بجلی کے انگارے ایک تسلسل سے دہکتے رہے اور مکتا بھی ...

دلیپ رائے نے بیٹھنے کے لئے پلنگ کی طرف ہوتے ہوئے مکتا کے شانوں پر اپنا بازو رکھا، اور پلنگ کی پٹی کے پاس آ کر کھڑی ہوئی مکتا سے کہا "میرے انتخاب پر رشک آ رہا ہے یا نہیں ؟"

مکتا کے ہونٹ ذرا سا کپکپائے. دلیپ رائے کا سوال راست تھا، ان کے دل سے وابستہ لیکن مکتا کو لگا ـــــــ جیسے وہ کیا کھویا اور کیا پایا کا حساب لگا رہے ہوں۔

منہ سے نکلا "بہت اداس ہو ؟"

یہ مکتا کے پہلے الفاظ تھے جو دلیپ رائے کے سامنے منہ سے نکلے۔

وہ کچھ چونک سے گئے ـــــــ "اداس ؟"

مکتا نے کمرے کے اس گوشے کی طرف دیکھا ـــــــ جہاں بچے کی اور اس کی ماں کی تصویر تھی ـــــ پلنگ کے بازو پر بیٹھے ہوئے دلیپ کی اس طرف پشت تھی۔ انھوں نے مکتا کی نظر کی سمت پیٹھ موڑ کر دیکھا ...

پھر خاموش سے ہو گئے، شاید سوچ نہ سکے تھے کہ آج کی رات کی پہلی بات چیت کی جڑیں بھی ماضی میں ہوں گی۔

مکتا کے اندر سے ٹھنڈ کی ایک کپکپی سی اٹھ کر اس کی انگلیوں کے پوروں تک پھیل گئی۔۔۔۔ اور اس کا سرد ہاتھ، ایک بے بسی میں، دلیپ رائے کے پہلو سے چھو گیا شاید کسی اطمینان کی جستجو میں۔۔۔۔

دلیپ رائے نے مکتا کو بازوؤں میں بھر کر خود سے منسلک کر لیا۔۔۔۔ آنکھیں مندسی گئیں۔۔۔۔ مکتا کی بھی۔۔۔

مکتا کو لگا۔۔۔۔ جیسے وہ دونوں، موت کی یخ بستگی سے بچ کر جیتے جاگتے گوشت کی حدت ڈھونڈ رہے ہوں۔۔۔۔

بجلی کی، کوئلوں کی شکل کی ہانڈیوں کے بٹن پلنگ کی ایک سمت میں اس طرح لگے تھے کہ جتنے کوئلے چاہو بجھا دو، دلیپ رائے نے کچھ بٹن دبا کر صرف ایک کوئلہ جلتا رہنے دیا، باقی بجھا دیئے۔۔۔۔

سچ مچ یخ بستہ فضا تھی۔۔۔۔ دونوں کے وجود کو کسی مقام سے منجمد کرتی اور جس کو ایک دوسرے کی آگ کی حرارت درکار تھی۔۔۔

رات یوں گزری۔۔۔ کہ گوشت کے سرد ہاتھ ساری رات گوشت کی کانگڑی سینکتے رہے۔

رات کا آخری پہر آیا۔ رات کی حرارت سے بھرا ہوا اور بستر کی سفید چادر میں دو جسم جل جل کر بجھے ہوئے پڑے تھے، راکھ کے گرم ڈھیروں کی طرح۔۔۔

صبح کی روشنی شاید شعور ہوتی ہے مکتا کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ کے دو

کنارے ایک دوسرے سے بہت دور لگے اتنے کہ اس نے گھبرا کر بازو پھیلائے، دلیپ رائے کا بازو تھامنے کے لئے، لیکن دیکھا.... دونوں کے وسط میں ایک بچے کی لاش پڑی تھی جس کے اوپر سے بازو اُدھر تک لے جانا ممکن نہیں تھا۔

(۴)

دلیپ رائے کی زندگی میں مکتا پہلی عورت نہیں تھی لیکن مکتا کی زندگی میں دلیپ رائے پہلا مرد تھا اور پہلے مرد کے ساتھ گزاری رات مکتا کے لئے مہیب حد تک خوب صورت تھی ـــــ ایک پورے وجود کی، ایک پورے وجود کے ساتھ بجھائی ہوئی پیاس .... اتنی کہ صبح کی روشنی میں وہ دلیپ رائے کے چہرے کی طرف ایک ٹک تکتی رہی ـــ لگا، آج ایک بوند پانی بھی اس نے ہونٹوں سے چھو کر نہیں دیکھا اور اس کے ہونٹ پیاسے تھے ....

لیکن دلیپ رائے کا احساس اس کے برعکس تھا۔ ایک اُس پیاس کی تسکین کا جو اس سے پہلے کبھی بہم نہ ہوئی تھی۔ عورت پہلے بھی بدن سے مس ہوئی تھی لیکن لگا... آج جیسی رات کا لمس اس کے بدن نے کبھی نہیں پایا تھا۔ انھوں نے بھی مکتا کو صبح کی روشنی میں حیرانی سے دیکھا... لیکن دونوں نے اپنی حیرانی کے مطلب جانے، دوسرے کی حیرانی

کے نہیں، اس لئے چائے کی میز پر ایک عجیب خاموشی چھا گئی یوں کہ جیسے خاموشی صرف آنکھوں سے دیکھنے کی چیز ہو اور جس سے گھبرا کر دونوں نے اپنی نگاہیں موڑ لیں۔

دلیپ رائے اپنے کام پر چلے گئے۔ گھر کے مہمانوں میں سے تین تو رات کی گاڑی سے چلے گئے تھے اور ایک آج صبح کی گاڑی سے، ماں نے ابھی کچھ دن رہنا تھا لیکن کسم نے آج دوپہر کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہونا تھا اس لئے مکتا اکیلی ہوئی تو کسم اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے کرتے اچانک سنجیدہ ہو کر کہنے لگی "بھابی! میں ایک بات کی آپ سے معافی چاہتی ہوں کل میں نے بہت چاہا تھا کہ گھر میں آویزاں کچھ تصویریں اتار دوں پچی مان گئی تھیں لیکن بھائی صاحب نہیں مانے، مجھے معلوم ہے، ایک تصویر اُن کے کمرے میں ہے.... رات.... تمہاری پہلی رات بھی....

مکتا نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور دھیمے لہجے میں کہا "مجھے معلوم ہے ——— کل تم نے چھوٹے کمرے میں سے ایک تصویر اتار کر الماری میں رکھ دی تھی ..... لیکن کیوں؟ میں نے پھر وہیں سجا دی تھی ...."

دوپہر ماں نے اس الماری کی چابی مکتا کے حوالے کی جس میں اس کے لئے خریدے گئے کپڑے تھے اور وہ سوٹ کیس بھی جو مکتا اپنے ساتھ لائی تھی۔ کسم اس کے ساتھ مل کر سوٹ کیس والے کپڑے الماری میں رکھواتی رہی۔ اُس نے بتایا "پہلی بھابی کے کپڑے بھی بہت اعلیٰ تھے، کئی تو بھائی جان فرانس سے خرید کر لائے تھے بالکل نئے پڑے تھے

لیکن چچی نے اُن میں سے کوئی کپڑا تمہاری الماری میں نہیں رکھوایا کہ شاید تمہیں یہ بات پسند نہ آئے ...."

اچانک مکتا کو لگا۔ کسی نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا ہے ——— یہ بھی محسوس ہوا، یہ ہاتھ کپڑوں والے اس بند ٹرنک میں سے نکل کر آیا ہے جو گھر کی ماں نے نہ جانے کہاں ٹرنکوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیا تھا۔

الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے مکتا کے ہاتھ ٹھٹھک گئے .....

ہاتھوں کا لمس، شانوں سے اترتا، ریڑھ کی ہڈی میں پھیل گیا۔

مکتا نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے الماری کی طرف دیکھا .... یہ خوابگاہ کی دوسری الماری تھی۔ پہلی الماری کے برابر پیمائش کی۔ اور اس کے متوازی کھڑی ہوئی، جس میں سے صبح کو دلیپ رائے نے اپنے کپڑے نکالے تھے۔

پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دکھائی دے رہا تھا کہ یہ الماری اُسی کی ہوا کرتی تھی۔ جس کے کپڑے اس میں سے نکال کر اب کسی ٹرنک میں بند کر دیئے گئے ہیں۔

چیزوں میں شاید برتنے والے کا ہمیشہ کچھ سما جاتا ہے ——— لوہے میں بھی، لکڑی میں بھی، مکتا کو الماری میں سے ہلکی سی مہک آئی۔

ایک لمبا سانس بھر کر دیکھا لیکن جان نہ سکی کہ یہ باس کسی کے ہاتھوں کی تھی یا لکڑی میں سمائے کسی عطر کی ....

ہونٹوں کے پاس سوچ کی ایک لکیر سی کھنچ گئی ——— اگر لکڑی پر یا لوہے میں کوئی باس سمائی رہ سکتی ہے تو اس بدن میں بھی ضرور ہو گی جو روزانہ سے ہاتھوں

میں لپیٹ کر رکھتا تھا۔

پچھلی رات کو ذہن میں یہ بات آئی تو مکتا نے دلیپ رائے کے بدن کو جیسے پھر سے چھوا، بازو سے لپٹ کر ایک گہری سانس کھینچی لیکن کچھ یاد نہ آیا.....

شاید جسم کی دہکتی آگ کے بیچ، صرف آگ کی خوشبو ہوتی ہے اور کسی چیز کی نہیں.... اور شاید اور سب کچھ اُس میں بھسم ہو جاتا ہے....

مکتا کی سوچ کو کسم نے توڑ دیا، پوچھ رہی تھی "بھابی! کیا سوچ رہی ہو؟"

مکتا نے پہلی بار جانا ——— کچھ سوچیں صرف مہک جیسی ہوتی ہیں ——— ہاتھ سے پکڑ کر کسی کو دکھائی نہیں جا سکتیں.... ہر وقت ہوتی بھی نہیں، بارشوں کے موسم میں خود ہی آجاتی ہیں۔ گھروں کے کونوں میں ژولیدہ سی بیٹھ جاتی ہیں، اور پھر دھوپ کے وقت وہ جانے کہاں چلی جاتی ہیں۔

"بھائی صاحب کو کچے قیمے کے کباب بہت پسند ہیں" ——— ملائم ریشم کی ساڑھی کی تہہ لگاتے ہوئے کسم نے اچانک کہا۔

"کچے قیمے کے؟" مکتا نے چونک کر کسم کو دیکھا۔ کسم بتانے لگی، "جب وہ بمبئی آتے ہیں، میں انھیں بنا کر کھلاتی ہوں۔ ذرا محنت پڑتی ہے پہلی بھابی کبھی نہیں بناتی تھی"....

"تو مجھے سکھا دو"... مکتا نے کہا اور من میں ایک ہنسی سی آگئی، یاد آیا ——— ماں کئی بار کہا کرتی ہیں کہ مرد کا من زبان میں ہوتا ہے...

"میں تمہیں کاغذ پر سارا طریقہ لکھ دیتی ہوں، مشکل نہیں، صرف ذرا

محنت پڑتی ہے" اور کسم جب کاغذ پر لہسن کا، موٹی الائچی اور انڈوں کی زردی کا حساب لکھ رہی تھی تو مکتا کو لگا جیسے وہ ایک ادھیڑ عمر عورت کی طرح کسی سیانے سے ویسکرن منتر لکھوا رہی ہو....

کسم لکھتے لکھتے زبانی بھی بتا رہی تھی کہ کچے قیمے کو کس طرح سل باٹ پر پیسنا ہوتا ہے اور ساتھ ہنس بھی رہی تھی "لیکن بھائی صاحب کو کھاتے ہوئے پتہ ہی نہیں لگتا کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔ وہ تو بھابی، بس تمہاری طرف ہی دیکھتے رہیں گے۔" دیکھا تھا صبح ——————

—————— چائے کے وقت، بس وہ تمہاری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ چچی بھی اندر جا کے ہنستی رہیں۔"

مکتا کو خیال آیا —— صبح کو وہ بھی تو انھیں تکے جا رہی تھی۔ کسم نے یہ بھی دیکھا ہوگا، ماں نے بھی....

اور سوچ ادھر چلی گئی .... جدھر رات کو، خواب گاہ کے کونے میں ایک تصویر پڑی تھی اور جو تمام رات اسے دیکھتی رہی تھی اور جس نے تمام رات پلکیں نہیں جھپکائی تھیں۔

۵

حلق کے پاس جیسے آواز نہیں تھی۔۔۔

لیکن باقی سب اعضا کے پاس تھی، اعضا ہی کو سنائی دینے والی۔ دوسری رات آئی لیکن اسے پہلی کے بعد دوسری کہنا گویا اس کی توہین ہے۔۔۔

دلیپ رائے نے محسوس کیا ——— یہ رات بھی پہلی ہے، نئی اور کنواری۔

ایک استعجاب ہوا ——— کیا ہر رات کا پہلی بار آنا ممکن ہے؟ اور مستقبل میں بھی ممکن ہوگا۔ جانا نہیں جا رہا تھا کہ اس ملائم سی اور ریشم کے گچھوں جیسی لڑکی کے پاس کیا ہے، جس کے اندر ان کا جسم ریشم کے کیڑے کی طرح لپٹا جا رہا ہے۔۔۔

نہیں، انہیں محسوس ہوا ——— کچھ ہے، جو سب کچھ دینے کے بعد بھی وہ اپنے پاس رکھ لیتی ہے، بچا لیتی ہے اور جسے پانے کے لئے پوری لذت میں آلودہ جسم، پھر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی جانب بڑھتا ہے۔۔۔

کملا نے اس رات کچھ جانا لیکن دلیپ رائے کے مفہوم میں نہیں، صرف اپنے مخصوص معانی میں، بہت نجی مطالب میں ——— کہ رات کی یہ گھڑیاں ہَوَن کی آگ کی طرح روشن رہتی ہیں اور جس میں دلیپ رائے جو کچھ بھی علیحدہ ہے، اکیلا ہے اور ہَون کی سامگری کی طرح بھسم ہو جاتا ہے۔

اور جو سچ باقی رہ جاتا ہے، وہ صرف آگ ہے....

مکتا نے یہ بھی جانا ـــــ کہ ہر طلوع ہوتا دن اس یخ بستگی میں سانس لیتا ہے، جس میں گھر کے چھوٹے بڑے کام، اس خس و خاشاک کو مجتمع کرنے کے مصداق ہوں گے، جن کے سہارے اس رات کی آگ روشن کرنا ہوگا۔

دن کی ٹھٹھرن سے گھبرا کر....

اپنی اپنی تنہائی سے گھبرا کر....

اور شاید ہمیشہ..... ساری عمر، کیونکہ آج کی رات کے چوتھے پہر مکتا کو وہی احساس ہوا کہ پلنگ کے دو کنارے ایک دوسرے سے بہت دور ہیں اتنے کہ ایک کنارے سوئی مکتا کا دوسرے کنارے سوئے ہوئے دلیپ تک ہاتھ نہیں پہنچ رہا۔

آج اس چوتھے پہر کے بعد مکتا کو نیند نہ آسکی۔ ابھی صبح کاذب کا عمل تھا۔ جب وہ جاگی اور گھر کے پائیں باغ میں چلی گئی۔ ہر بوٹے کو، ہر شاخچے کو ہتھیلیوں سے چھوا جیسے پتے پتے سے شناخت حاصل کر رہی ہو....

اور صبح کی روپہلی روشنی میں مکتا نے کچھ پھول اور پتیاں چنیں، پانی کے ایک گلاس میں ترتیب کے ساتھ آراستہ کیں اور کمرے میں لوٹ آئی۔ کمرے میں ـــ بس فرش تھا اور پلنگ، اس لئے پھولوں کے رکھنے کے لئے ایک ہی جگہ تھی، جہاں نظر پڑی ـــــ دیوار کے کونے والا حجری تابدان، جہاں وہ تصویر رکھی تھی۔ اس لئے مکتا نے وہ پھول بھی تصویر کے پہلو میں رکھ دیئے....

مکتا نے جب پھول توڑے تھے، تو تصویر ذہن میں نہیں تھی، لیکن کمرے میں آکر تو اس تصویر نے جیسے وہ پھول مانگ لئے تھے۔

وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن پھول تصویر کے پاس رکھ دیئے تو سوچ کی کرن نے اسے بھالا مارا "کچھ پھول صرف قبر پر چڑھانے کے لئے اگتے ہیں — شاید میں بھی ...."

اس وقت تک مکتا کی ساری سوچ — راست تھی، سادہ تھی اور اس عورت کی سوچ کے ساتھ جڑی ہوئی جس کی موت کے بعد اس کے مرد کو مکتا نے اپنا بنا لیا تھا...

لیکن جس وقت صبح کے ناشتے کی چار میز پر آئی تو دلیپ رائے اپنے کمرے سے تیار ہو کر کام پر جانے کے لئے آئے — تو مکتا کی ساری سوچ راستے سے بھٹک گئی....

اچانک اس موڑ پر آگئی، جہاں سے ایک نیا راستہ، جانے کہاں لے جانے والا اس کے پاؤں کے آگے آگیا...

آج دلیپ رائے نے مکتا کی طرف دیکھا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح چائے کی پیالی کی طرف۔

نظر میں پل کی وابستگی تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ایک ٹھنڈی سی لکیر، مکتا کے شانوں سے اتر کر ریڑھ کی ہڈی میں پھیل گئی آج کمرے میں کسم بھی نہیں تھی اور ماں بھی نہیں، اس لئے مکتا نے کچھ

کھل کر کئی بار نظر بھر کے دلیپ رائے کی طرف دیکھا — ایک تنا ہوا جسم، ترشے ہوئے نقش لیکن جس سے ہر چیز کے ایک فاصلے پر ہونے کا احساس ہوتا ہو.....

من کے کیڑے بھی ..... اعضاء کے قریب ہو کر کھڑے ہوئے لیکن اعضا کو چھونے کے بعد .....

اچانک .... ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا لئے سکریٹری کمرے میں آیا "سر یہ تار" دلیپ رائے نے نظر اٹھا کر اُدھر دیکھا، تو اُدھر کی آواز اُدھر، جہاں تھی، وہیں ایستادہ ہو گئی۔

"دفتر میں بیٹھو!" دلیپ رائے نے آہستگی سے کہا اور کیتلی میں سے گرم چاء پیالے میں انڈیلی۔

"سر!" ایک بار اُدھر کی آواز پھر ابھری شاید کام کے انتہائی ضروری ہونے کا تقاضہ تھا یا شاید کسی بڑے نقصان کا....

دلیپ رائے نے کہا کچھ نہیں، صرف اُدھر دیکھا.... شاید جو پہلے کہا تھا وہ ابھی تک ہوا میں معلق تھا۔ اور وہی آگے بڑھ کر سکریٹری کے ہاتھوں سے ٹکرایا۔ وہ الٹے پاؤں واپس چلا گیا —— باہر والے، گھر کے آخری کنارے پر بنے ہوئے اس کمرے میں جو نہرو پلیس والے دفتر کا گھر میں بنا ہوا حصہ تھا۔ دفتر کے اوقات سے علاوہ اور علیحدہ۔

مکتا کو لگا —— دلیپ رائے نے گھر کے اوقات کا ایک ٹکڑا ابھی اس کے سامنے اوقاتِ کار سے قطع کر کے، کمرے میں رکھا ہے۔

انگوں میں خوف کی ہلکی سی ایک لکیر کھنچ گئی، اس لئے نہیں کہ دلیپ رائے کو گھر کی تنہائی میں کام کی دخل اندازی پسند نہیں تھی، بلکہ اس لئے کہ وقت کے اس ٹکڑے کو انھوں نے ایک سرد چاقو سے چیر کر علیحدہ کر دیا تھا۔

ایک وضاحت —— لوہے کی دھاری جیسی تیز لیکن ٹھنڈی

دلیپ رائے اٹھ کر کمرے سے جانے لگے تو ایک نظر مکتا کی طرف دیکھا اور پوچھا "کوئی چیز چاہئے۔"

مکتا کے ہونٹوں کے پاس ایک مسکراہٹ ابھری، جیسے نہیں کا لفظ ابھرا ہو اور جب دلیپ رائے کمرے سے چلے گئے تو مکتا کو لگا۔ ان کا کمرے میں ہونا اور نہ ہونا اُن کا اطاعت گزار ہے، ایک حکم میں بندھا ہوا۔

زمین کی کششِ ثقل کی طرح

اور مکتا کو پہلی بار لگا —— ایک اور راستہ بھی ہے جو ایک اور قبر کو جاتا ہے، پتہ نہیں کس کی.... نمعلوم کہاں....

لیکن صبح کا وہ احساس من میں اور گہرا ہو گیا —— کچھ پھول صرف قبر پر چڑھنے کے لئے آگئے ہیں.... شاید میں بھی....

پاؤں، بے حس سے، خواب گاہ میں پلٹے

لیکن وہ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر ٹھٹھک گئی۔

جیسے کمرا اپنا نہ ہو، کسی اور کا ہو....

آنکھوں میں پلنگ کی شناخت تھی، اور پلنگ کے پاس پڑے بجلی

کے بجھے ہوئے کوئلوں کی بھی۔ لیکن کمرے کی ایک سرد سی باس تھی — جو اجنبی تھی۔۔۔۔

من میں بیتی ہوئی رات سلگی اور اس کی ساری حرارت جانی پہچانی لگی۔ لیکن یوں، جیسے کوئی دیرینہ حادثہ ہو — حال سے ٹوٹا ہوا۔۔۔ حال، سکڑ، سمٹ کر، کمرے کی دہلیز میں بیٹھا ہوا لگا اور کمرے کے اندر کچھ اس طرح جھانکتا ہوا جیسے اندر صرف تاریخ کے کھنڈرات ہوں۔

مکتا نے اس اچنبھے کو پاؤں کے تلووں تک محسوس کیا۔ لگا — شاید ہر رات۔ صبح کی کرن پڑتے ہی تاریخ کا کھنڈر بن جایا کرے گی اور ہر دن وہ حال ہوگا جو کمرے کے باہر رہے گا۔

فرش یا دیوار کا سہارا کافی نہیں تھا — جو دہلیزوں میں کھڑے اس کے حال کو اندر کمرے میں لے جائے، کمرے کی ہر چیز کے ساتھ جوڑ دے اور دیپ رائے کی عدم موجودگی کے ساتھ بھی۔

موت کا ایک تار سا ہاتھوں میں آیا — یاد آیا، بیاہ کی رسم کے لئے اس کے ماں باپ کو اپنا گھر دیپ رائے کی آمد کے لئے بہت چھوٹا لگا تھا، اپنے وجود پر خجل۔ اور اپنی نیچی سوچ کی طرح سہم کر کھڑا ہوا۔ اور انھوں نے گھر آکر سندیسہ بھیجا تھا کہ یہ رسم باہر کسی مانگے کی جگہ پر ادا کی جا سکتی ہے۔۔۔

گھر کے کسی دوست نے یہ بھی بتایا تھا کہ اب بڑے ہوٹلوں میں بھی، ہون کی آگ کے لئے کرائے کے کمرے بن گئے ہیں۔۔۔۔

تب مکتا کو لگا تھا — جیسے کسی بھی گھر کی زمین اس کے پاؤں

تلے نہیں .... آنکھوں کے آگے ایک خالی پن لہرا گیا تھا۔ جو کرائے کے کمرے سے لے کر کرائے کے رشتوں تک پھیلتا نظر آرہا تھا۔

لیکن اس گھڑی مکتا کو، دلیپ رائے نے ہاتھ دے کر بچا لیا تھا، جو بی پیغام بھیجا کہ یہ رسم اُسی گھر میں ہوگی، باہر کہیں نہیں....

اور رسم والی رات، دلیپ رائے کو جے مالا پہناتے وقت مکتا کی آنکھوں میں وہ خیر مقدم بھی امڈ آیا تھا۔ جو صرف اس کی جانب سے نہیں تھا بلکہ گھر کے فرشوں کی اکھڑی اور دراڑوں سے پٹی اینٹوں کی طرف سے بھی تھا۔

آج اس گھڑی، اُس بیتی ہوئی گھڑی کا سہارا لے کر، مکتا نے دلیپ رائے کے کمرے کے ساتھ جڑنا چاہا —— اس کے پاس جا کر، اُس کی روح کو ہاتھوں سے چھو کر.... اپنا بنا کر.... اور وہ پاؤں پر دباؤ سا ڈالتی —— پلنگ کے پاس آئی، لیکن پاؤں پلنگ کے پائے سے ٹکرا کر الجھ گئے۔

ایک خیال آیا جو پہلے نہیں آیا تھا —— رات جس گھڑی جسم کا جسم پر حق ہوتا ہے، کیا وہ حق سچ مچ ہوتا ہے؟

لگا —— دلیپ رائے کا وجود اس کے لئے، پوری دھرتی بن جاتا ہے، قطب شمالی سے لے کر قطب جنوبی تک —— جن کی ویرانیوں میں وہ راستہ بھول جاتی ہے، اور وہ میل ہا میل تک گھوم کر بھی دھرتی کا سراغ نہیں پا سکتی۔ اور ہاتھ ایک لامتناہیت میں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔

لیکن دلیپ رائے، کبھی بھی اُسے دھرتی کی طرح نہیں ملتے، وہ ہمیشہ ایک گنی ناپی چیز کی طرح، اُسے آنچ میں سنبھال لیتے ہیں۔ چاہیں تو

ایک بازو میں سمو لیتے ہیں اور چاہیں تو ایک کنارے ڈال دیتے ہیں۔
آنکھوں میں پانی بھر آیا، لگا، اس کا وجود اتنا چھوٹا ہے کہ آنکھوں کے پانی میں ہی ڈوب سکتا ہے۔۔۔۔
اور مکتا کو لگا ——— کسی اور کی نہیں، اپنی قبر ہے، کہیں بنی ہوئی جس پر چڑھانے کے لئے، وہ پھول کی طرح اگی ہے۔

۶

ماں گھر میں تھی تو مکتا کو گھر کی رسوئی میں جانا آسان نہیں لگتا تھا ——— ماں سوچے گی، میں گھر کا سب کچھ اپنے ہاتھوں میں لے رہی ہوں۔ بہت جلدی، اس لئے جو کچھ جس کے ذمے تھا اسی طرح رہنے دیا گیا۔
یوں بھی۔ ابھی تک اس نے دلیپ رائے کی پسند یا ناپسند کو نہیں جانا تھا۔ سوائے اس کے کہ دوپہر اور شام کو بھاپ میں پکی ہوئی سبزیوں کی ایک پلیٹ ضرور بنتی تھی جو ماں نے کبھی نہیں کھائی تھی۔ شاید پسند نہیں تھی لیکن وہ میز پر ضرور چنی جاتی تھی جس سے لگتا تھا ——— وہ دلیپ رائے کے کھانے کا ایک ضروری حصہ بنی ہوئی ہے۔
ماں کوئی بیس دن کے بعد واپس پنجاب چلی گئی، تو اُس شام مکتا نے کسم کا لکھ کر دیا ہوا پرچہ نکالا اور پہلی بار گھر کی رسوئی میں گئی۔ اس

دن مکتانے کچے قیمے کے کباب بنائے۔

شام کو، روز کی طرح دلیپ رائے نے اسکاچ وہسکی کا ایک پیگ بنایا اور مکتا کے لئے گلاس میں سیبوں کا رس انڈیلا تو اُس وقت مکتانے، کچھ شرماکر کبابوں کی پلیٹ میز پر رکھ دی۔

گھر میں اس کا یہ پہلا اہتمام تھا۔ اس لئے یہ شرمیلا پن کچھ نئی طرز کا تھا اور جس سے بچنے کے لئے اس نے سیبوں والے گلاس کو ہاتھ میں لے کر گھونٹ لیا، بھی لیکن گلاس کو ہونٹوں سے دور نہیں ہٹایا۔ شاید چہرے کو تھوڑی سی اوٹ درکار تھی۔ خواہ گلاس کی گولائی کی تین انچ کے برابر کی اوٹ ہی تھی۔۔۔۔

اچھا۔۔۔۔ دلیپ رائے نے کباب کے ذائقے کو پہچانتے دھیرے سے کہا اور پھر بڑے اہتمام سے مکتا کو دیکھا۔

مکتا کا کچھ مسکرا دینا برمحل تھا لیکن اپنے ہونٹوں میں سمٹی سی یہ مسکراہٹ بھی مکتا کو بامو قع نہ لگی۔ لگا —— کباب کے ذائقے کے بارے میں تو معلوم نہیں لیکن اس نے اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ بطور رشوت استعمال کی ہے۔

مکتا کی آنکھیں، خجل سی، —— نیچے فرش کی طرف دیکھنے لگیں۔۔۔۔

فرش کے سفید سیمنٹ میں ملے ہوئے پتھر کے چھوٹے اور سیاہ ٹکڑے آنکھوں کے آگے سرسرانے لگے۔۔۔۔

من میں ایک وہم سا اٹھا —— یہ رشوت، جو آج ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بن کر آئی ہے، کبھی لفظ بن کر بھی آسکتی ہے۔۔۔ اور مکتا

کو کسی سے نہیں .... بس اپنے ہونٹوں سے خوف آنے لگا ...

لیکن اس خوف میں ایک نئی قسم کا خوف سرسرایا "نہیں، دلیپ رائے کے سامنے اس کے ہونٹ لفظوں کی رشوت نہیں دے سکیں گے، وہ صرف گھبرا کر، کسی دن کسی بھی گھڑی سسک اٹھیں گے۔

—— اور گھر کی ہوا میں اس گناہ کا اقبال پھیل جائے گا جو ابھی، صرف اس کے من میں سمٹا ہوا ہے۔

ایک اندیشے کی طرح، مکتا کی آنکھیں، اوپر نہیں ہو رہی تھیں۔ دلیپ رائے نے اس اندیشے کو سمجھا لیکن اندیشے کی مہیب کیفیت کو نہیں۔

کہا —— مس دہلی کے ہاتھوں کے بنے ہوئے کباب بھی ملیں گے، یہ نہیں سوچا تھا ....

من کی حدت سے ہونٹ بھی پگھلے تو دلیپ رائے نے قریب ہو کر مکتا کے ہونٹوں کو چھوا ....

مہک دہکی کی بھی تھی، بھنے ہوئے کباب کی بھی اور دلیپ رائے کے سانسوں کی بھی ..... مکتا مہک میں بھیگ گئی۔

من گیلا ہو گیا تو مکتا کو لگا —— جیسے آنکھوں کا وظیفہ آج من نے انجام دیا ہو"

"مس دہلی!".... دلیپ رائے کے ہونٹوں کے پاس ایک ہلکی سی شوخی آئی ....

"کسم نے بتایا تھا"، مکتا نے آہستہ سے پوچھا۔

"—— کیا ؟"

"کہ میں مس دہلی بننا چاہتی تھی"

لیکن بن نہیں سکی ....

بن سکتی تھی ... مشکل نہیں تھی ....

باہر کی مشکل کا پتہ نہیں، لیکن مشکل اندر تھی، گھر میں

گھر سے اجازت نہیں ملی تھی ... مجھے معلوم ہے ...

پھر جو بن نہیں سکی .... مکتا کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

کہنا چاہتی تھی "پھر مس دہلی کیوں کہتے ہو"، پہلی رات بھی یہی کہا تھا...

مکتا کو پہلی رات بھی اس لفظ میں ایک ہلکے طنز کا احساس ہوا تھا،

آج بھی ہوا۔ لیکن چاہتے ہوئے بھی نہ پوچھ سکی۔

لگا —— ہون کی آگ، ہاتھوں میں ایک رشتہ تھما سکتی ہے۔ لیکن

اس کی روشنی دلوں کے دہکتے کوئلوں تک کبھی نہیں پہنچ سکتی اور وہ کوئلے

کسی بھی رشوت کی حدوں سے باہر رہ جاتے ہیں۔

دلیپ رائے مکتا کے اور پاس آئے اور ہنس دیئے۔ کہنے لگے "اگر اخباروں

میں یہ خبر چھپتی تو ہی تسلیم کی جاتی، کبھی وہ خبر بھی سچی ہوتی ہے جو اخباروں

سے باہر رہ جاتی ہے ....

کیا مطلب ؟ ....

فارم بھرا جاتا، تو آخر یہ فیصلہ کسی آدمی نے ہی کرنا تھا نا ....

"ہاں، جو کوئی بھی جج ہوتا ....

"کوئی جج یا جیوری، پر وہ میں بھی ہو سکتا ہوں ..... یہ کافی نہیں ؟
مکتا نے پورے من سے مسکرانا چاہا، لگا، اگر اس کا مطلب صرف اتنا ہی سیدھا اور واضح ہے تو ان خبروں کا اخباروں سے باہر رہ جانا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اخباروں میں شائع ہو جانا ..... وہ خبر صرف کچھ دنوں کے لئے ہوتی ہے اور یہ جو اخباروں سے باہر ہے، عمر بھر کے لئے ہو سکتی ہے۔

لیکن مکتا چاہ کر بھی مسکرا نہیں سکی، لگا ان کے من کو اخبار کی طرح عام سی آنکھوں سے نہیں پڑھا جا سکتا۔

کل اتوار ہے، میرا خیال ہے مس دہلی نے پوری دہلی نہیں دیکھی ہوگی، کل صبح، بہت سویرے دور تک جایا جا سکتا ہے ــــ" ایک لانگ ڈرائیو" دلیپ رائے نے کہا" اور مکتا کا دل ہلکا ہو گیا۔

یہ آج پہلا دن تھا جب دلیپ رائے نے مکتا کو اپنے ساتھ کہیں لے جانے کے لئے کہا تھا۔ وہ پچھلے دنوں میں تین بار گھر سے باہر گئی تھی۔ اپنے ماں باپ سے ملنے۔ اور تینوں بار ڈرائیور آئے۔ صبح کے وقت گاڑی میں بٹھا کر لے گیا تھا اور شام کے وقت واپس لے آیا تھا۔ دلیپ رائے نہ تو اس کے ہمراہ وہاں گئے تھے اور نہ ہی اور کہیں چلنے کے لئے اُس سے کہا تھا۔ جس کا سبب مکتا نے آپ ہی آپ تلاش کر لیا تھا ــــ کہ گھر کے حادثوں کے بعد یہی کچھ ممکن تھا۔ آج صبح انھوں نے ایک لانگ ڈرائیو کے لئے کہا، تو مکتا کو لگا ــــ جیسے وہ حادثوں کی سرحد سے گزر کر کچھ اس طرف، اُس کے قریب آ رہے ہیں۔

اگلے روز منہ اندھیرے جاگنا تھا۔ دلیپ رائے نے چائے کا تھرمس اور پنیر بسکٹ جیسی کچھ چیزیں ساتھ لے چلنے کی ہدایت کی تھی۔ چنانچہ مکتا رات کے آخری پہر جاگ اٹھی اور پھر آنکھ نہ لگی۔

رات کے اس پچھلے پہر کی بیداری پر مکتا کے من پر خنک اوس کے قطرے نمودار ہونے لگے —— کیا وہ سچ مچ حادثات کی سرحدوں سے گزر کر کچھ ادھر اس کی سمت آرہے ہیں؟ یا اس کی کلائی تھام کر بھی اسے اُدھر حادثوں کی سرحد کے اندر کھینچے لئے جارہے ہیں؟

لگا —— شاید اسی طرح، وہ اس کے ساتھ ایک لانگ ڈرائیو پر جاتے ہوں گے...... اسی طرح چائے کی تھرمس اُن کے ہمراہ ہوتی ہوگی...

مکتا نے لرز کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا —— یقین نہیں آرہا تھا کہ کیا ان نئے ہاتھوں کے ساتھ ان کے بیتے ہوئے دنوں کو سنبھالا بھی جاسکے گا؟

لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ مکتا نے الماری کے پاس جاکر اسے کھولا اور وہ چابی نکالی جو ماں نے جاتے وقت اسے دی تھی کہ یہ پہلی دلہن کے ٹرنک کی چابی ہے۔ تمہارا جی چاہے تو کھول کر اسی میں سے برتنے کے لئے چیزیں نکال لینا اور جی چاہے تو کسی اور کو دلوا دینا۔ مکتا نے برہنہ پا اسٹور میں جاکر وہ ٹرنک کھولا جس میں پہلی دلہن کے کپڑے سنبھال کر طے کئے ہوئے رکھے تھے اور ماں نے وہ ٹرنک بند کر دیا تھا....

کئی ساڑھیاں مکتا نے ہاتھوں میں اٹھائیں اور پھر رکھ دیں، پتہ نہیں چل رہا تھا کہ نئے ہاتھوں سے پرانے دنوں کو تھامنے کے لئے کن

تاروں کا سہارا لیا جا سکتا ہے ....

ایک ساڑھی، آنکھوں کو بہت علیحدہ سی لگی ـــــ رنگوں کی باریک لکیروں کے جال میں لپٹی ہوئی، خیال آیا شاید یہ وہی ہو جس کے بارے میں کسم نے بتایا تھا وہ فرانس سے خرید کر لائے تھے ....

مکتا نے ٹرنک بند کر دیا، وہ ساڑھی باہر رکھ لی اور غسلخانے نہانے کے لئے چلی گئی اور نہا کر اس ساڑھی کو زیب تن کرتے ہوئے عجیب احساس ہوا ـــــ جیسے وہ کپڑے نہیں، جنم بدل رہی ہو۔

ابھی اندھیرے کا پہرا تھا، جب گاڑی میں چائے اور باقی لوازمات رکھوا کر مکتا نے دلیپ رائے کو جگایا لیکن جاگنے اور تیار ہونے کے دوران شاید انھوں نے غور نہیں کیا لیکن باہر آ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایک بار انھوں نے مکتا کو دیکھا تو مکتا کو لگا ـــــ ان کا تارِ نظر ساڑھی کے دامن میں الجھ کر رہ گیا ہے ....

لیکن دلیپ رائے نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ گاڑی چلانے لگے۔ اور مکتا گاڑی کی کھڑکی میں سے دلی کے کھنڈرات کو دیکھتی، سوچ کے نشیبوں میں اتر گئی ـــــ پتہ نہیں اس دل نے میرے اندر کتنی بار تعمیر ہونا ہے اور کتنی بار کھنڈر ہونا ہے۔

(۷)

ڈاکٹر نے مکتا کا معائنہ کیا اور دلیپ رائے کو پہلی مبارکباد دی اور دوسری مکتا کو۔

یہ وہی ڈاکٹر تھا، جس کے ہاتھوں دلیپ رائے کے گھر پہلے بچے نے جنم لیا تھا۔ اسے اُس بچے کی موت کا بھی علم تھا، اس لئے اس کی نظروں میں اس وقت مبارک باد کا پہلا حق دار دلیپ رائے ہی تھا۔

دلیپ رائے کو ایک گونہ اطمینان کا احساس ہوا۔ لیکن ڈاکٹر کے جانے کے بعد جب انھوں نے مکتا کو آنکھ بھر کر دیکھا تو لگا کہ یہ اطمینان کا احساس انھیں اپنے لئے اتنا نہیں ہوا تھا جتنا مکتا کے لئے....

جس دن مکتا نے گھر کی پہلی دلہن کے کپڑے نکال کر پہنے تھے، دلیپ رائے نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اپنا وجود پہن کر نہیں۔

آج انھوں نے مکتا کو آنکھ بھر کر دیکھا تو مکتا مسکرا دی لیکن پل بھر کے اطمینان کے بعد دلیپ رائے نے محسوس کیا ـــــ کہ مکتا کی مسکراہٹ جیسے کسی کھنڈر میں سے نکل کر سامنے آئی ہو ـــــ ماضی کی دھول میں لپٹی ہوئی اور کنارے سے اور بھری ہوئی

ـــــ تو خوش نہیں ؟ خوشی کے اس اولین پل میں دلیپ رائے نے مکتا سے پوچھا لیکن اپنے الفاظ کانوں کو عجیب سے لگے۔

"خوش ہوں" ـــــ مکتا نے کہا لیکن اتنی عجلت میں جیسے پاؤں لڑکھڑا

گیا ہو۔

دلیپ رائے نے ایک سنجیدگی کے ساتھ مکتا کی اس گھبراہٹ کو سہ لیا۔ اور اس کا اور اپنا دھیان کسی اور سمت موڑنا چاہا۔ پوچھا، تمہارا من کیا چاہتا ہے بیٹی ہو یا....

لڑکا .... مکتا نے بڑی تیزی سے کہا۔

دلیپ رائے ہنس دیئے، کچھ کہا نہیں لیکن سوچا ـــــ ہر عورت یہی کہتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں، عورت کو اپنی جنس اچھی نہیں لگتی....

کہا ـــــ اگر لڑکی ہو تو ؟

ـــــ ہو ہی نہیں سکتی

ـــــ کیوں ؟

ـــــ آپ نہیں جانتے۔

دلیپ رائے ہنس دیئے، لیکن مکتا ہنسی نہیں۔ اس نے صرف ایک پوشیدہ نظر سے ادھر دیکھا جدھر کمرے میں بچے کی تصویر پڑی تھی۔

ـــــ ماں کو خط لکھوں ؟ بہت خوش ہوگی .... دلیپ رائے نے کہا تو مکتا لرز سی گئی کہنے لگی ـــــ نہیں مجھے ڈر لگتا ہے....

ـــــ ڈر ؟ کس سے ؟

ـــــ پتہ نہیں .... شاید یہ کہ سچ نہیں، خط نہ لکھنا۔

دلیپ رائے پھر ہنس دیئے اور کہنے لگے "اچھا نہیں لکھتا، اگلے ہفتے لکھوں گا یا اس سے اگلے ہفتے، جب تم کہو گی....

پھر دو ہفتے بھی بیت گئے لیکن خط لکھنے کا لمحہ آکر بھی نہیں آیا، مکتا اچانک درد سے تڑپنے لگی اور ڈاکٹر نے آکر کہا کہ اس بچے کو بچایا نہیں جا سکتا۔ ہلکا سا آپریشن کرنا پڑا لیکن مکتا کو درد سے سرخرو کر کے بھی، ڈاکٹر کو علم تھا کہ اس وقت تسلی اور ہمدردی کی جتنی ضرورت مکتا کو ہے اتنی دلیپ رائے کو نہیں۔ اس لئے ڈاکٹر نے بڑی اپنائیت کے ساتھ مکتا پر وقت صرف کیا اور یقین دلانا چاہا کہ مستقبل کے لئے اس کے دل میں کوئی سہم نہیں بیٹھنا چاہئے۔ مکتا کی ماں بھی اس دن پاس ہی تھی۔ اس نے گھبرا کر ڈاکٹر سے پوچھا تھا کہ ایک بار جو یوں ہو جائے تو کیا ایسا ہمیشہ کے لئے ہوتا رہتا ہے؟ اس پر ڈاکٹر نے مکتا اور ماں کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا تھا کہ آئندہ سے وہ پہلے دن سے ہی مکتا کی حفاظت اپنے ذمے لے لیگا۔

مکتا نے صرف سنا، پوچھا کچھ نہیں .... شاید سنا بھی نہیں۔ ڈاکٹر چلی گئی، ماں چلی گئی تو اس نے صرف دلیپ رائے سے کہا "آپ بہت اداس ہیں"

دلیپ رائے نے کچھ پریشان ہو کر مکتا کی طرف دیکھا۔ وہ یرقان زدہ سی پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کا یہ سوال کچھ تکلیف دہ ہو سکتا تھا لیکن دلیپ رائے کو ایسا نہیں لگا بلکہ لگا ..... یہ لفظ آج کے نہیں، شادی کی پہلی رات کے ہیں اور یہاں دلیپ کے پاس ایستادہ ہیں ..... ان کو پہلی رات پہلی بار مکتا نے یہی الفاظ کہے تھے ....

کچھ سمجھ میں نہ آسکا تو دلیپ رائے پلنگ کی پٹی پر مکتا کے برابر بیٹھ گئے

اور اس کے ایک ہاتھ کو اپنی ہتھیلیوں میں ملفوف کر کے اس کو تکنے لگے۔
دیکھا ـــــ مکتا کی آنکھوں میں شبنم امڈ آئی ہے ...
"یونہی ہونا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا"... مکتا نے دھیمے لہجے میں کہا اور ایک سرد سانس کھینچا، جیسے ایک آخری فیصلہ اپنے ہی منہ سے اپنے کانوں کو سنایا ہو۔
ـــ مکتا!" دلیپ رائے کے منہ سے نکلا تو مکتا نے ایک خشک سا سانس بھرا اور اُن کی اور دیکھا۔
لگا ـــ اس درد کی گھڑی وہ مکتا کے قریب ہو گئے تھے ـــ اس لئے شاید انھوں نے آج "مس دہلی" بھی نہیں کہا۔ آج پہلی بار "مکتا" کہا تھا۔
لیکن دلیپ رائے اُسی طرح حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید اُس کی طرف نہیں۔ صرف ان الفاظ کی طرف "یونہی ہونا تھا، مجھے لگ رہا تھا۔"
ـــ کیا سوچ رہے ہیں؟ مکتا نے اچانک پوچھا۔
ـــ تمہیں یوں کیوں لگا تھا مکتا؟ شاید کوئی بات ہے، جو تم مجھ سے کہتی نہیں ہو.... دلیپ رائے کا سوال، سیدھا مکتا کے بدن سے ٹکرایا تو مکتا نے گھبرا کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے حلقے میں سے نکال لیا۔
کچھ، بچے کے وجود سے بھی بڑھ کر جیسے مکتا کے جسم سے بہہ گیا ہو.... اور وہ بالکل بے جان سی کمرے کی دیواروں کی طرف دیکھنے لگی۔

—— مکتا!

دلیپ رائے نے مکتا کے ہونٹوں کے قریب جھک کر یوں آواز دی ۔ جیسے کئی قدم کے فاصلے پر جانے والے کو زور سے پکار کر روکنا چاہ رہے ہوں۔

مکتا کا من لرز کر تھم گیا —— دور جانے کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں، اس لئے وہیں ایستادہ ہو کر، کانپ کر، دلیپ رائے کی طرف دیکھنے لگی۔

دلیپ رائے کو یاد آیا —— آج سے کئی دن پہلے، اُس دن جس دن ڈاکٹر نے پہلی بار مبارک دی تھی۔ اس دن بھی مکتا نے کہا تھا —— نہیں، ماں کو خط نہ لکھنا، مجھے خوف آتا ہے ...

یوں لگا، کچھ ہے، جو مکتا کو اندر سے توڑ رہا ہے۔

شاید وہی کچھ آج اسے یوں لہو لہان کر رہا ہے ...

دلیپ رائے نے آہستہ سے مکتا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

مگر دلیپ رائے کی ہتھیلی سے مَس ہو کر مکتا کے ماتھے کی شریان پگھل گئی اور آنکھوں میں اوس بن کر امڈنے لگی۔

دلیپ رائے نے اُس کی آنکھوں میں گھر آئی شبنم کو پوروں سے چُنا اور اُس کو ہنسانے کی کوشش میں کہا "تم عورتوں کو کچھ باتوں کا آپ ہی کیسے پتہ چل جاتا ہے؟

معلوم ہے ماں کیا کہا کرتی تھی؟

—— کیا؟

کہ یہ ضرور لڑکا تھا، اسی لئے چلا گیا... لڑکی ہوتی تو یوں ہوتا ہی نہیں، لڑکیوں کا جنم یوں ہوتا ہی نہیں... سو اگلی بار کے لئے تم ابھی سوچ لو کہ لڑکی ہوگی، اس لئے پھر یہ بات نہیں ہوگی.... ہونے والی کون سی بات ہے؟

— نہیں، اگلی بار بھی لڑکی نہیں ہوگی۔

مکتا کے منہ سے یوں نکلا، تو دلیپ رائے پھر کچھ چونک گئے، لیکن مسکرا کر پوچھنے لگے —

تم عورتیں یہ سب کیسے جان لیتی ہو؟ اس رات بھی تم کہتی تھیں....

— مجھے علم تھا....

— کس طرح —

— یہ راہل تھا.....

دلیپ رائے نے مکتا کے منہ سے اپنے مرے ہوئے بچے کا نام سنا اور ہڑبڑا کر مکتا کی طرف دیکھا۔

— سچ مچ یہ راہل تھا... مکتا کے من نے یہ جانا، کہنا چاہا کہ میں یہاں آئی تھی تو میری گود میں اس کی لاش پڑی تھی.... وہی ہر روز ہمارے پلنگ پر ہوا کرتی تھی.... ہم دونوں کے درمیان.... اب وہی میرے اندر تھی....

لیکن مکتا کی زبان سن ہوگئی، یہ سارا بھیانک پن زبان پر منجمد ہو کر رہ گیا....

"مکتا!" دلیپ رائے نے گھبرا کر مکتا کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا —

یہ پاگل پن ہے مکتا، تم یہی سوچا کرتی تھیں، تمہیں اسی لئے ڈر لگتا تھا ؟
مکتا نے زرد ہو کر دلیپ رائے کی طرف دیکھا، پھر کانپتی ہوئی سی کہنے لگی ـــــ وہ اس لئے مر گیا تھا کیونکہ میں نے چاہا تھا۔
ـــــ پگلی ! تم نے تو اسے ....
لیکن مکتا دلیپ رائے کی بات سنے بنا کہہ گئی ـــــ "نہیں، یہ میں نے سوچا تھا کہ وہ نہ ہو ....."
ـــــ تم نے اسی لئے کئی مہینے تک شادی کے لئے "ہاں" نہیں کی تھی ؟
دلیپ رائے نے بہت آہستہ اور سنبھلی ہوئی آواز میں پوچھا۔
ہاں اسی لئے .... اور صرف اس لئے نہیں کہ آپ کا صرف ایک بچہ تھا، اس لئے بھی کہ پہلے میری جگہ کوئی اور تھی .... اب نہیں ہے، پر پہلے تھی .... اور وہ کیوں تھی ...
ـــــ وہ میری بیوفائی تھی ... دلیپ رائے نے ایک بار ہنس کر کہا، پھر پلنگ پر سے اٹھ کر، پلنگ کے برابر ایستادہ ہو کر مکتا کی طرف دیکھتے ہوئے تصویر درد بن گئے، کہنے لگے ـــــ "تم نے سچ مچ مجھے اس طرح چاہا ہے مکتا ؟"
اور پھر وہ مکتا کے ہونٹوں کے پاس جھک کر کہنے لگے ـــــ خطرناک عورت ! جب تجھے سوچا تھا تو یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ ...
مکتا نے اپنی تھرکتی بانہہ اُن کے گلے میں حمائل کر دی اور کہا ـــــ لیکن میری محبت میں یہ گناہ کیوں شامل ہو گیا ؟ میں آپ کو پانا چاہتی تھی کہ آپ کسی اور کے نہ ہوں، بچے کے بھی نہیں، لیکن میں نے بچے کی موت نہیں مانگی تھی۔

چاہتی تھی کہ وہ نہ ہو لیکن یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مر جائے...

دلیپ رائے نے اپنے ہاتھوں سے جیسے سچائی کے ایک پل کو چھو لیا تھا۔ مکتا کی محبت کو بچے کا وجود قبول نہیں تھا لیکن موت بھی نہیں، اور اس بات کو جتنا مکتا نے بھی نہیں پایا تھا، اس سے کچھ زیادہ دلیپ رائے نے پالیا

مکتا نے پھر کہا — میں اپنے اور آپ کے درمیان وہ بچہ نہیں چاہتی تھی، سو وہ نہیں رہا اور اس کی جگہ اس کی میت نے لے لی تھی ..... اور اسی جگہ پلنگ پر ....

مکتا صبح کو جاگی تو دیکھا ——— کمرے میں مقررہ جگہ پر وہ تصویر نہیں تھی۔ جو دلیپ رائے نے کسی کے کہنے پر بھی کمرے سے نہیں اٹھوائی تھی۔

مکتا نے آہستہ آہستہ اٹھ کر کمرے کی الماری ٹٹولی تو وہ تصویر مل گئی اس نے تصویر پھر الماری میں سے نکال کر صاف کی اور اسی جگہ رکھ دی جہاں ہوا کرتی تھی۔ دلیپ رائے نے تصویر کو پھر اسی جگہ دیکھ کر مکتا کی طرف دیکھا، تو مکتا ہنس دی۔ اب یہ میرا بھی ہے۔ آپ کا بیٹا ہوا سب کچھ میرے بیتے ہوئے میں شامل ہو گیا ہے ——— میرا بن گیا ہے... میرا اپنا۔ سارا حساب کھو رس ہے؟

تمام شد

ہماری دیگر مطبوعات

ناول

ترے کوچے سے ہم نکلے	عطیہ پروین	۲۵/-
گرزر	عزیز احمد	۳۵/-
جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں	عزیز احمد	۱۰/-
جاتی ہوئی رت	کشمیری لال ذاکر	۲۵/-
عداوت	بالا دوبے	۲۵/-
نگارینہ	ثریا محمود ندرت	۲۵/-
ناظرہ	ہاجرہ نازلی	۲۵/-
سولیوں سے پرے	انصر کرم قدوائی	۲۵/-
جزیرہ سخنوراں	غلام عباس	۸/-
چچا چھکن	امتیاز علی تاج	۱۰/-
دل کے دروازے	عطیہ پروین	۲۵/-
واپسی	آمنہ ابوالحسن	۱۸/-
آنگن	خدیجہ مستور	۳۰/-
سپنے کب اپنے	فرخندہ شمیم	۲۴/-
غم کے سائے	بیگم محمودہ بشیر	۳۵/-

زرد چاندنی	عقیلہ ہما	۳۰/-
کرماں والی	کشمیری لال ذاکر	۲۰/-
بردہ فروش	جمنا داس اختر	۵/-
۱۹۸۴ء	جارج آرویل	۱۵/-
کینسر وارڈ	الیگزینڈر سولنسٹین	۱۸/-
سلمیٰ سے دل لگا کر	نیرو اسطی	۱۸/-
حماقت	کہر لدھیانوی	۶/-

افسانے ڈرامے

سوکینڈل پادر کا بلب	سعادت حسن منٹو	۱۸/-
ایک ٹانگ کی گڑیا	کنور سین	۲۰/-
برف پر مکالمہ	سریندر پرکاش	۱۸/-
انتظار حسین کے سترہ افسانے	انتظار حسین	۱۸/-
نیا اردو افسانہ انتخاب و احتساب	کمار پاشی	۱۸/-
اداس شام کے آخری لمحے	کشمیری لال ذاکر	۱۲/-
بادل گرجیں جمنا پار	سدرشن شرما	۱۸/-
پھول کھلے ویرانے	حسن نجمی	۱۰/-
خالی خانے (ڈرامے)	انل ٹھکر	۲۰/-
بہو کی تلاش (ڈرامے)	آنسہ نورالعین صدیقی	۱۲/-
شیر کیا سوچتا ہوگا (نفسیاتی افسانے)	سید رفیق حسین	۱۵/-

پری خانہ	واجد علی شاہ کی خود نوشت حیات معاشقہ	۱۵/-
برگردن راوی	ایم۔ اے وحید	۱۸/-
چوری سے یاری تک (انشائیے)	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۸/-
تین چہرے ایک سوال	کشمیری لال ذاکر	۴/۵۰

شخصیات

انیس: شخصیت اور فن	ڈاکٹر فضل امام	۶۰/-
حرفِ اقبال: اقبال کا مطالعہ	پروفیسر حامدی کاشمیری	۲۵/-
محمد اقبال: ایک ادبی سوانح حیات	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۲۵/-
شاعرِ آخر الزماں جوش ملیح آبادی	ڈاکٹر فضل امام	۳۰/-
گوپال متل: شخصیت اور فن	کمار پاشی	۵۰/-
میراجی: شخصیت اور فن	" "	۴۰/-
منٹو: شخصیت اور فن	پریم گوپال متل	۴۰/-
ن۔م۔ راشد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر شہریار	۴۰/-
ساحر لدھیانوی: ایک مطالعہ	مخمور سعیدی	۳۰/-
کالی داس گپتا رضا: تخلیق تالیف اور شعر کی روشنی میں	ظفر ادیب	۳۵/-
فن اور شخصیت: آپ بیتی نمبر	مرتبہ: کالی داس گپتا رضا	۵۰/-
بسمل سعیدی: شخص و شاعر	مخمور سعیدی، پریم گوپال	۱۸/-

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دوسری منزل ● امرتا پریتم